اقبال اور اقبالیات

پروفیسر عبد الحق

شعبۂ اردو

دہلی یونیورسٹی دہلی

اقبال اور اقبالیات

پروفیسر عبدالحق

شعبۂ اردو

دہلی یونی ورسٹی، دہلی

یہ کتاب اردو اکادمی، دہلی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی

جملہ حقوق بحق مصنف

جنوری	۲۰۰۶ء
تعداد	پانچ سو
قیمت	۳۰۰/روپے
ناشر	عبدالحق، سی ۱۴، چھاتر مارگ دہلی یونی ورسٹی، دہلی ۷
کمپوزنگ	ریاض احمد فون: ۹۸۱۱۱۴۹۰۱۷

IQBAL AUR IQBALIAT

Prof. Abdul Haq

Rs. 300/-

شریکِ حیات

ناہید رحمٰن

کے نام

سوز و گدازِ زندگی لذتِ جستجوئے تو

ترتیب

۱۔	اقبال اور مقامِ شبیریؓ	۹
۲۔	اقبال کے عمومی اثرات	۱۷
۳۔	اقبال کا شعری آہنگ	۳۰
۴۔	سرسید مصدرِ اقبال	۴۹
۵۔	اقبال کی غالب شناسی	٦۰
٦۔	اقبال کی بیدل شناسی	۸۷
۷۔	اقبال اور تصوف	۹۹
۸۔	اقبال کی تحریروں میں تحریف	۱۱۱
۹۔	اقبال اور نقدِ فراق کی نارسائی	۱۲۷
۱۰۔	کرتا ہے ترا جوشِ جنوں تیری قبا چاک	۱۴۰
۱۱۔	گذشتہ دہائی میں اقبالیات	۱۴۹
۱۲۔	علی گڑھ میں اقبالیات	۱٦۳
۱۳۔	ابلیس کی شورائی مجلسیں	۱۷۲

اعتذار

ترتیب وترجمہ کے علاوہ اقبال پر ناچیز کی یہ چوتھی تالیف ہے۔ جس میں مختلف اوقات اور متعدد مذاکروں میں پیش کئے گئے مضامین شامل ہیں۔ کچھ مطبوعہ اور کئی غیر مطبوعہ ہیں شائع شدہ مضامین پر نظر ثانی کے علاوہ خاطر خواہ اضافے بھی کئے گئے ہیں۔ یہ مذاکرے مختلف موضوعات پر منعقد کئے گئے تھے۔ جیسے بیدل، سرسید، غالب، انیس، آزاد، کیفی، تصوف، تحقیق وغیرہ۔ ناچیز نے اپنی سہولت کے لئے ان مباحث کو اقبال کی تحریروں کے سیاق ولحاق اور ان کے تفکیری تناظر میں دیکھنے کی طالب علمانہ کوشش کی ہے۔ ارتباط واسالیبِ فکر کی دریابی کے دوران محسوس ہوا کہ کلامِ اقبال بالیقین ایک جامِ جہاں نما ہے جس میں حرف وصوت کے ہزاروں پیکر آویزاں ہیں۔ جس زاویہ سے دیکھئے افراد وآثار، تلمیح وتصور کی دلاویز صورتیں فروزاں ہیں۔ ان میں جم وکے یا سنجر وسلیم کی دارائی اور جنید وبایزید کی درویشی کے احوال ومقام دانش وبینش کو دعوتِ نظر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی تخلیقات میں علم وآگہی کے امکانات کی بے کراں دنیا آباد ہے۔ مختلف شعبہ ہائے علم کے سینکڑوں موضوعات شعرِ اقبال میں محفوظ ہیں۔ جن میں ہر دور کے تقاضے اور تعبیر کی قندیل روشن ہے۔ عالمی ادبیات میں کسی فن کار کے یہاں وسعتوں کی یہ پہنائی ابھی تک پیدا نہ ہوسکی۔ ان کے ادبی اظہار کا تنوع بھی حیرت خیز ہے۔ موضوع کی تکثیریت کی طرح

اسالیب کی جہات کا شمار بھی ہماری یادداشتوں میں کسی اور سے منسوب نہیں ہے۔ ادب ودانش کے مہمات مسائل کو اقبال کے آثار وعلائم سے مربوط کرنے میں مجھے کوئی مضائقہ محسوس نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان کا کلام اپنی نمود کے لئے صرف معاصر تاریخ وتحریک کا موہونِ تخلیق نہیں ہے۔ اس میں صدیوں کی ثقافتی روح اپنے سوز وگداز کے ساتھ رواں دواں ہے۔ اس کی بازگشت ہمیں بیدار رہنے کے لئے مجبور کرتی ہے۔ شاید اسی لئے ہم کلامِ اقبال پڑھتے وقت ایک لمحے کے لئے بھی غنودگی یا غفلت سے دوچار نہیں ہو پاتے اور نہ ہی بے تکلف ہو پاتے ہیں۔ خود اقبال نے اپنے کلام کی قراءت کے آداب مقرر کیے ہیں۔ فرزانگی کی سکت وسمائی سے محروم مردِ ناداں کو باز رہنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ فہم وفراست کے نگہبانوں کے لئے اس میں بڑے اشارے ہیں۔ صاحبِ نظر کی غلط بینی بھی کبھی کبھی تقدیر ساز قوتوں کی حلیف بن جاتی ہے۔ تاریخ میں ہماری کم نظری کے سبب سفینوں کے ڈبو دیئے جانے کے ان گنت حادثات نے ہمیشہ شرمسار کیا ہے۔

ان مضامین میں موجود کوتاہیوں کے لئے نادم ہوں۔ مجھے احساس ہے کہ یہ تشنۂ تکمیل ہیں۔ انھیں کہیں زیادہ موثر اور مربوط ہونا چاہیے تھا۔ خاص طور پر تکرار کے لئے معذرت عذرِ گناہ سے بھی بدتر ہے۔ سرسید اور علی گڑھ میں اقبالیات یا گذشتہ دہائی میں اقبالیات کے ساتھ ابلیس کی شورائی مجلسوں میں تجزیے اور حوالوں کے اعادہ سے شرمندہ ہوں۔ ناچیز ان دوستوں اور کرم فرماؤں کا احسان مند ہے جنھوں نے مذاکروں میں مدعو کرکے ان مضامین کو قلم بند کرنے کی توفیق سے نوازا۔

عبدالحق

یکم ذی الحجہ ۱۴۲۶ھ

۲/جنوری ۲۰۰۶ء

اقبال اور مقامِ شبیریؓ

تاریخ تہذیبی تلاطم سے عبارت ہے مگر تصادم سے کسی نئی زبان کا وجود میں آنا ایک لسانی معجزہ ہے۔ اردو اسی اعجاز کی مظہر ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس میں ایک ثقافتی تاب کاری اور تخلیقی توانائی ہے۔ وہ اپنی کم عمری کے باوجود رزمیہ شاعری کے عظیم الشان سرمایہ اور ثروت سے گراں مایہ ہے۔ آفریں ہو ان بزرگوں پر جنھوں نے تاریخ کو تخلیق کا شاہ کار بنا دیا اور علامہ شبلی نے اس تخلیق کو تنقید کی تقدیس بخش دی۔ اس صِنف ادب نے تحریک وتسلسل کی صورت گری اختیار کی۔ فن کار مختلف ادوار میں نفسِ مضمون اور اظہار میں توسیع وتبدیلی بھی کرتے رہے۔ غرض یہ سلسلۂ تخلیق رواں دواں ہی رہا۔ انیس ودبیر کے بعد حالی نے شخصی مرثیہ کی شروعات کی۔ حالی کا یہ شعری اجتہاد تھا۔ جس کی تقلید اور توسیع میں اقبال نے ایک امکانی دنیا کی آگہی شامل کر دی۔ حالی نے غالب کو منظوم خراج پیش کیا اور ان کی شخصیت کی شبیہ سازی میں غالب کی طرفگی اور تقابل میں ان کے قد وقامت کو قدما سے بھی بلند تر بنا دیا:

میں نے سب کا کلام دیکھا ہے   ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں

حالی نے نثر میں بھی ''یادگارِ غالب'' جیسی انمول کتاب پیش کی۔ کئی ناقدین نے

اقبال کو حالی کی توسیعی صورت کہا ہے۔ اس کا یقین اس امر سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اقبال نے بھی غالب کو منظوم خراجِ عقیدت کے ساتھ نثر پاروں میں بھی اکثر و بیشتر ان کے فن کی فسوں کاری پر بڑے ہی فکر انگیز خیالات کا اظہار کیا ہے۔ گویا حالی کے بعد اقبال دوسرے غالب شناس ہیں جنھوں نے عظمتِ غالب کے اعتراف میں جس تنقیدی بصیرت کا اظہار کیا ہے وہ غالبیات میں ہنوز نایاب ہے، اقبال نے رثائی ادب کا مطالعہ کیا تھا۔ انیس و دبیر کی تخلیقات سے بھرپور واقفیت رکھتے تھے۔ لکھنؤ کے بعض ناقدین نے اقبال کی زبان و بیان پر اعتراضات کئے تو اقبال نے اپنی دفاع میں، کلامِ انیس سے استناد پیش کئے۔ ایک دوسرے خط میں مرثیے کی مقبولیت کا ایک انتہائی فکر انگیز سبب بیان کیا ہے انھوں نے اظہار واسالیب سے استفادے کے علاوہ موضوعات میں بھی نئے امکانات اور جہات کی تخلیقی صورتیں پیش کیں۔ اور انھیں فکر و فلسفہ سے ہم آہنگ کیا۔

ہے الم کا سورہ بھی جزوِ کتابِ زندگی

یا

میری فطرت کی بلندی ہے نوائے غم سے

اقبال نے تین اہم شخصی مرثیے لکھے۔ 'مرثیۂ داغ' 'والدہ مرحومہ کی یاد میں' اور 'مسعود مرحوم'۔ ان میں زندگی کے درد و داغ کے ساتھ عقیدت و احترام کے بے پایاں جذبات موجود ہیں۔ اور حیات و موت کی فلسفیانہ تعبیریں کائنات کی کھلی حقیقت بیان کرتی ہیں۔

ہے خزاں کا رنگ بھی وجہِ قیامِ گلستاں

یا

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے

یا

جوہرِ انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں

اقبال کی کئی مرثیہ نما نظمیں بھی ملتی ہیں۔ جنھیں مرثیوں میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ جیسے فاطمہ، بنت عبداللہ، شبلی و حالی، سوامی رام تیرتھ اور متروک کلام میں شامل دوسری

نظمیں۔ نظم فاطمہ بنت عبداللہ کا یہ شعر قابلِ توجہ ہے۔

ہے جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر
ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت کس قدر

اقبال کی فکر میں یہی شوقِ شہادت ہے جس کی مختلف صورتوں نے شاعرِ رنگیں نوا کے کلام کو گل گونۂ خوں سے لالہ زار کیا ہے اس تمہید سے قطعِ نظر میرا معروضہ ہے کہ اقبال نے مرثیہ کی تقدیس کو جو تفکیری بلندی و برنائی بخشی ہے اس کی مثال پورے رثائی ادب میں کہیں نہیں ملتی اور نہ کوئی دوسرا ان کا حریف ہو سکا۔ مفکر شاعر سے ہم یہی توقع بھی کرتے ہیں۔ اقبال نے مروّجہ ہیئت و ساخت کے اجزا و عناصر سے قطعِ نظر اسما و اماکن کے ساتھ حادثے کی سنگینی اور ان سے حاصل ہونے والے پیغام کو نفسِ موضوع بنایا۔ حضورِ رسالت مآبؐ کی بیٹی، داماد اور نواسے کی مقدس سیرت و شہادت بنی نوعِ بشر کے لئے آئینۂ تمثال ہیں۔ بیٹی اور داماد کا تذکرہ مرثیہ میں ناگزیر ہے مگر اصطلاحی گفتگو میں واقعۂ کربلا ہی مرثیہ نگاری کا محور و مرکز ہے۔ راقم بھی اقبال کے ان فکر انگیز اور لاثانی تصورات سے صرفِ نظر کرتا ہے۔ جن میں حضرتِ فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرتِ علیؑ کی ذات و صفات پر شاعرِ مشرق نے عقیدت و ارادت کے گنج ہائے گہر پیش کئے ہیں۔ جذبۂ عقیدت و افکار سے معمور یہ خیالات بھی ہماری تخلیق و تاریخ میں ناپید ہیں۔ حضرتِ حسینؓ کی ذاتِ والا صفات باطل طاقتوں سے ان کی جنگ آزمائی اور شہادت سے برآمد ہونے والے نتائج اقبال کے قلب و نظر میں ہمیشہ طوفان و تلاطم برپا کرتے رہے ہیں۔ ان کی مثالی شخصیت اقبال کے مردِ مومن کے لئے تصورات کی بنیاد فراہم کرتی ہے۔ ان کی شہادت ایمان افروزی کی دلیل ہی نہیں وہ پیکارِ زندگی میں عزم و استقلال کی قندیل ہے۔ شہادت کی یہ سلسبیل ہماری زندگی کا نصب العین ہے اس میں مالِ غنیمت اور کشور کشائی کی خواہشات مذموم ہیں۔

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن   نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی
دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو   عجب چیز ہے لذتِ آشنائی

اقبال کے کلام میں جہاں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ وہ کسی نہ کسی طرح اسی شہادت

سے نسبت رکھتا ہے۔ حد یہ ہے کہ اقبال کو مناظرِ فطرت کا وہی شاہ کار محبوب ہے جو حسینؑ نسبت رکھتا ہے۔ فکر و نظر میں لالے سے وابستگی محض اس برگزیدہ نسبت کے سبب ہے۔

گل و نرگس و سوسن و نسترن — شہید ازل لالہ خونیں کفن

سرِ خاکِ شہیدِ برگہائے لالہ می پاشم — کہ خونش بانہال ملتِ ما سازگار آمد

خیاباں میں ہے منتظر لالہ کب سے — قبا چاہیے اس کو خونِ عرب سے

اسی شہادت کے سبب ہر قطرۂ لہو زندگیٔ جاوداں حاصل کرتا ہے۔ لہو کا استعارہ ہو یا علامت سب شہادت کے ایک ہی مرکز سے وابستہ ہیں۔

لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں

یا

لہو خورشید کا ٹپکے اگر پتھر کا دل چیریں

سمجھا لہو کی بوند اگر تو اسے تو خیر — دل آدمی کا ہے فقط اک جذبۂ بلند

یا

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام

خدائے ربِ جلیل کے روبرو بے چون و چرا سرِ نیاز پیش کر دینے کا جذبۂ شوق ہی تکمیلِ زندگی ہے۔ یہی شوقِ شہادت ہے جو اسلام کی تاریخ کے دو کمانوں یعنی اول و آخر کے درمیان سر رشتۂ حیات کی دعوت دیتا ہے۔ کیوں کہ تاریخ حادثات سے مرتب ہوتی ہے۔ اور حادثات عزمِ جواں اور اضطرابِ پیہم سے نمود حاصل کرتے ہیں یہی لافانی نقوش افراد و ملت کو آدابِ جنوں سکھاتے ہیں جنوں خیزی ہی جبر و استبداد کے ایوانوں میں زلزلہ طاری کرتی ہے۔ ہماری ثقافت ان حوادث سے ہمیشہ نبرد آزما رہی ہے۔ اسی پیکارِ حیات نے تازگی و طرب ناکی بخشی ہے۔

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم

نہایت اس کی حسینؓ ابتدا ہے اسمٰعیلؑ

اسلامی تاریخ کی اس سے بہتر ترجمانی مفکرین اور مفسرین نہ کر سکے۔ تاسیسِ بنائے

دین ذبحِ عظیم سے شروع ہوتی ہے۔ اور اس کی تکمیل شہادتِ حسینؑ پر ہوتی ہے۔ یہ نہ استعارہ ہے اور نہ علامت بلکہ بدیہی حقیقت ہے کچھ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ فن اور اس کے متعلقات ہندی اساطیر کی شبیہ ہیں۔ ان پُر فریب بیانات کو خاطر میں نہ لایا جائے۔ اقبال کی رفعتِ فکر دیکھیے انھوں نے ۱۹۳۰ء میں ہی باور کرایا تھا کہ یہ حقیقت ابدی ہے۔ حقیقت کو علائم واستعاروں کی ضرورت نہیں پڑتی۔ سینۂ کائنات کے اس راز کو بہ بانگِ اسرفیل کہنے کی ضرورت ہے۔

حقیقتِ ابدی ہے مقامِ شبیریؑ　　　　بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی وشامی

اقبال نے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ یہ حقیقتِ ابدی ہر زمانے میں زور و جبر کی طاغوتی طاقتوں سے نبرد آزما رہتی ہے۔ انھوں نے ایک اور مقام پر کوفہ وشام کے نئے پیکروں کی ملامت کی ہے۔

الاماں از روحِ جعفر الاماں　　　　الام از جعفرانِ ایں زماں

موسیٰ کی فرعون سے، ابراہیمؑ کی نمرود سے، چراغِ مصطفویؐ کا شرارِ بولہبی سے معرکہ آرائی سب اسی حقیقتِ ابدی کے انقلابات ہیں جن سے ثقافت وسیادت کی سیرابی ہوتی ہے۔ یہ میراثِ خلیل پیغمبرِ اعظم و آخرؐ سے ہو کر حسینؑ کے ہاتھوں براہ راست پہنچی ہے۔ انھوں نے کشادہ جبینی کے ساتھ یہ امانت ہمیں سونپ دی ہے۔ اقبال کی ندرتِ فکر کی بلندی دیکھیے۔

اک فقر ہے شبیریؑ اس فقر میں ہے میری
میراثِ مسلمانی سرمایۂ شبیریؑ

اس وراثت کی حفاظت خونِ گرم سے ہی ممکن ہے۔ جس کی منتہا و معراج جاں بازی وجاں سپاری کے ساتھ حصولِ شہادت ہے۔ جو کفن وکافوریا ماتم وشیون سے بے نیاز ہے۔ آپ اقبال کے آفاقی انسان کی جو بھی تعبیر کریں مجھے کہنے کی اجازت دیجیے کہ اس تصور کی پہلی زندہ جاوید شبیہ بہ قول پروفیسر رشید احمد صدیقی دلائے مصطفویؐ ہی ہے۔

ذکر وفکر وعلم وعرفانم توئی　　　　کشتی و دریا وطوفانم توئی

دوسری شبیہ خلفائے راشدین کی ہے۔

تازہ کن آئین صدیقؓ وعمرؓ　　　　چوں صبا برلالۂ صحرا گزر

عدلِ فاروقیؓ وفقرِ حیدریؓ است　　سروری در دینِ ما خدمت گری است

اور پھر اس مثالی انسان کے پیکر و پندار میں سرمایۂ شبیرؓ کا ضمیر اور خمیر شامل ہے۔ وہ انسان جس کی پیدائش و پرورش خاتونِ جنت کے مبارک آغوش میں ہوئی جو شانۂ رسولؐ پر سوار ہو کر اٹھکھیلیاں کرتا رہا اور زیرِ تیغِ پدر تربیت یافتہ ہو۔ اس تمثیل و تبریک کے لئے سب سے زیادہ وہی تاریخ میں حقدار ہوگا۔ نسبتوں کے ان تمام زاویوں پر اقبال نے پہلی بار مفکرانہ اجتہاد کئے ہیں۔ ان کے اظہار کے بعد بھی وہ متفکر تھے کہ حق ادا نہیں ہو پایا۔ مولانا گرامی کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

> ''فکر میں ہوں کوئی ایسا شعر نکلے کہ مضمون کے اعتبار سے ایک سو شعر کے برابر ہو''۔
>
> ''رموزِ بیخودی'' میں جذبۂ عقیدت کو فکر کی گہرائی میں اتارنے کے باوجود انھیں اطمینان حاصل نہ تھا۔ وہ نظم رثائی ادب کا لازوال شاہکار ہی نہیں۔ ادبی تخلیق و تاریخ میں الہام سے کم نہیں ہے۔

آں امامِ عاشقاں پورِ بتولؑ　　سروِ آزادے زبستانِ رسولؐ
موسیٰؑ و فرعون و شبیرؓ و یزید　　ایں دو قوت از حیات آید پدید
خونِ او تفسیر ایں اسرار کرد　　ملتِ خوابیدہ را بیدار کرد

اس بیداری کا انحصار یا اجارہ داری کسی ایک قوم کی نہیں ہے۔ دنیا کے تمام مظلوم انسانوں کی نجات کے لئے یہ اکسیرِ اعظم کی حیثیت رکھتا ہے۔ جو بیاضِ حسینؓ میں قیامت تک کے لئے نسخۂ شفا کی حیثیت رکھتا ہے۔

حسینؓ کے بغیر سوز وسازِ زندگی ممکن نہیں ہے اور نہ حریت و حرکت کے حصول کے وسیلے پیدا ہو سکتے ہیں۔ انھیں کی بدولت زندگی کے ساز کی مضرابی ممکن ہو سکتی ہے۔ اہلِ حق کے لئے آزادی کا پیغام اسوۂ حسینؓ میں ہی پنہاں ہے۔ محکومی و مظلومی انسانیت کے لئے ایک مذموم شے ہے۔ اس لئے نجات حاصل کرنے کے لئے ان کے سبق آموز کردار کو بے کم و کاست اپنانا ہوگا۔ رُموزِ بیخودی میں ارشاد ہے:

در نوائے زندگی سوز از حسینؓ　　　　اہلِ حق را حریت آموز از حسینؓ

مجھے اکثر حیرت ہوتی ہے کہ اقبال ہمیشہ بدر و حنین کی معنویت کو حسینؓ سے منسوب کرتے ہیں۔ وہ اگرچہ معرکوں میں بذات خود شریک نہیں ہوئے۔ مگر ان کے آبا و اجداد کی ظفریابی اور دعوت و عزیمت نے معرکہ کے ان میدانوں کو خونِ شہیداں سے لالہ زار کیا تھا۔ کلام میں بیشتر مقامات پر انھیں نسبتوں سے ذکر ہوتا ہے۔ تقریباً تمام مجموعہ ہائے کلام میں اس عظیم شخصیت اور ان کے شعارِ زندگی کا ذکر ناگزیر طور پر سامنے آتا ہے اسرار و رموز، پیامِ مشرق، زبورِ عجم، بالِ جبریل، پس چہ باید کرد اور ارمغانِ حجاز میں ان غزوات کے ساتھ ایک نسبت قائم کی گئی ہے۔

بالِ جبریل کا شعر ملاحظہ ہو:

صدقِ خلیل بھی ہے عشق صبرِ حسینؓ بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

'جاوید نامہ' کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیں۔

از نگاہِ خواجۂ بدر و حنین　　　　فقر و سلطاں وارثِ جذبِ حسینؓ

''پس چہ باید کرد'' کے یہ دو اشعار پیشِ خدمت ہیں اور غور و فکر کے مقتضی ہیں۔

فقرِ عریاں گرمئ بدر و حنین　　　　فقرِ عریاں بانگِ تکبیرِ حسینؓ
گرمئ ہنگامۂ بدر و حنین　　　　حیدرؓ و صدیقؓ و فاروقؓ و حسینؓ

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقبال کے نزدیک حق و باطل کی آویزشوں کی یہ ابتدا تھی جس کی انتہا حسینؓ کے ہاتھ کربلا میں انجام پاتی ہے۔ یہ جنگ و جدل صرف معرکے نہیں ہیں بلکہ مجاہدانہ زندگی کے معمولات ہیں۔ جن میں مالِ غنیمت کی حرص و ہوا اور منصب و مملکت کی خواہش حرام ہے۔ یہ حاکمِ مطلق کی سرفرازی اور اطاعتِ حق میں مردِ مسلماں کا نذرانۂ عبودیت ہے۔ جس کا بدل دولتِ کونین بھی نہیں ہے۔ تاریخ میں بدر و حنین ایک حقیقت ہے۔ جو راہِ حق میں جاں طلبی کی دعوت دیتا رہتا ہے۔ حسینؓ بھی اجداد کی تلواروں کے سائے میں پل کو جواں ہوئے تھے۔ پون صدی پہلے کی زبورِ عجم میں اقبال کی یہ پیشین گوئی آنے

والے حادثات کو بے حجاب دیکھ رہی تھی۔ جب ہی انھوں نے بڑی دردمندی سے ہمیں مخاطب کیا تھا۔ کہ عراق کے صحرا کب سے ہمارے منتظر ہیں اور حجاز کی کھیتیاں تشنہ کام ہیں۔ ایسے میں اپنے وجود کے کوفہ وشام سے نکل خونِ حسینؓ کی امانت سے ان ریگ زاروں کو لالہ زار بنایا جائے۔ بہ قول پروفیسر رشید احمد صدیقی ہر آزمائش کے وقت ہمارا رخ کربلا کی طرف ہونا چاہیے کوفہ کی طرف نہیں۔ دانائے راز کی پیشین گوئی ملاحظہ ہو:

ریگِ عراق منتظر کشتِ حجاز تشنہ کام　　　خونِ حسینؓ باز دہ کوفہ وشامِ خویش را

اقبال اس اضطرابی انتظار سے ہمیشہ دوچار ہے۔

قافلۂ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں
گرچہ ہے تاب دار ابھی گیسوئے دجلہ وفرات

اقبال کے فکری مناسبات کا صرف ایک پہلو پیش کیا جاسکا ہے۔ شرح وبیاں کے لئے کئی تصانیف اور کئی محفلیں درکار ہوں گی۔ آخری بات گوش گزار کرنے کی سعادت چاہتا ہوں۔ آپ کچھ اندازہ لگائیں کہ اقبال نے اپنے کلام کا اختتام بھی اسی اشارے پر کیا ہے۔ جو میرے نزدیک بڑی برگزیدگی کا حامل ہے۔ ہم آپ جانتے ہیں کہ ''ارمغانِ حجاز'' ان کا آخری مجموعۂ کلام ہے۔ جو عاشقِ رسولؐ کا نذرانۂ عقیدت ہے یہ بسترِ علالت اور آخری لمحات کی دل دوز آرزوؤں کا اظہار ہے جو ان کے انتقال کے بعد شائع ہوا۔ اس آخری کتاب کا اختتام اس رباعی پر ہوتا ہے:

قلندر میلِ تقریرے ندارد　　　بجز ایں نکتہ اکسیرے ندارد
ازاں کشتِ خرابے حاصلے نیست　　　کہ آب از خونِ شبیرؓ ے ندارد

اس نکتے کو ہم آپ فراموش نہ کریں کہ خونِ شبیرؓ کی روح کو خاطر میں لائے بغیر ہر عمل سعئ رائگاں ہے۔ مقدس آثار میں حرفِ راز کی طرف اشارہ ہے کہ اہلِ ایمان کی جان سپاری کے عوض بہشت ان کے لئے خریدی جاچکی ہے۔ کاروانِ وجود رواں دواں ہے۔ مردانِ حر کے قافلے کی قیادت کے لئے سپر سنبھالنے سے پہلے بازوئے جگر دار کی ضرورت ہے۔

شمشیرِ پدر خواہی بازوئے پدر آور

اقبال کے عمومی اثرات

مجنوں گورکھپوری نے اپنی کتاب کی ابتدا ان الفاظ میں کی ہے کہ دنیا میں کبھی کبھی ایسی ہستیاں پیدا ہوتی ہیں جو نہ صرف اپنے زمانے کے میلانات کے تابع ہوتی ہیں بلکہ خود ان پر قادر بھی ہوتی ہیں وہ مروجہ دھاروں کے رخ کو نئی سمتوں میں موڑ دیتی ہیں اقبال کا شمار بھی انھیں ہستیوں میں ہوگا۔ وہ اپنے زمانے کی مخلوق تھے مگر ایک نئے زمانے کے خالق بھی۔ فراق گورکھپوری کا یہ اقرار بھی دلچسپ ہے کہ ایشیا بھر کے شاعر مل کر اقبال کی اس غزل کا جواب نہیں لکھ سکتے۔

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا

محسوس ہوتا ہے کہ اقبال کے یہاں ضرور کوئی بات ہے جو دامنِ دل کو کھینچتی ہے۔ اور اعتراف کے لئے مجبور کرتی ہے۔ ان کے فلسفہ سے اتفاق نہ کرنے والوں کی مشکل ہے کہ وہ شعر کے جادوئی اثرات سے نہیں نکل پاتے۔ اور شاعری سے گریز کرنے والے ان کی فکر کی گرفت میں مبتلا ہوتے ہیں۔ شعر اور فلسفے کا ایسا خوب صورت امتزاج دنیا کے ادب میں بہت کم یاب ہے۔ فکر و فلسفہ کا جذبہ و احساس کی زبان میں ڈھل جانا ایک اعجوبہ ہے۔ اور اقبال کا سب سے بڑا امتیاز بھی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے تصورات شعر کے سہارے ہر خاص و عام پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ عوام کی زبان پر اقبال کے کتنے اشعار ایسے چڑھے ہیں

کہ ضرب الامثال بن گئے ہیں۔ گفتگو کے علاوہ تحریروں میں مختلف موقعوں پر استعمال کیے جانے والے اشعار میں سب سے زیادہ تعداد کلامِ اقبال کی ہے۔ صحائف سے قطع نظر اگر آپ اس حقیقت پر نظر ڈالیں کہ دنیا میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے تخلیقی ادب میں اقبال کا شمار ہے یہ ایک بڑی سچائی ہے۔ اقبال کی پہچان ایک لفظ سے ہوتی ہے جو ان کے فلسفے کی بنیاد ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے

دنیا کا کوئی فلسفہ عمومیت کی یہ مثال نہیں رکھتا۔ یہ لفظ ہمارے لاشعور کا حصہ بن گیا ہے۔ خودی کا نام آئے تو اقبال یاد آتے ہیں اور اقبال کا نام لیں تو بے ساختہ خودی یاد آتی ہے۔ راقم گاؤں کے ناخواندہ انسانوں کی زبان سے بھی یہ شعر سنتا رہا ہے۔

یہی اقبال کی اپنی انفرادی فکر ہے۔ جس میں مختلف افکار کا اجتماع ہے۔ یہی اجتماعیت اس کی دلکشی کی بنیاد ہے۔ مختلف فکری دبستانوں کے حوالے سے اس کا تجزیہ مشکل اور غیر مفید ہوگا۔ اس لئے کہ اس کی مرکزیت کے بکھر جانے کا اندیشہ ہے۔ سرچشموں کی تلاش تحقیقی بازآفرینی کے لئے مناسب ہوسکتی ہے۔ مگر موثرات کے لئے نقصان دہ ہے۔ یہ کہنا کافی ہوگا کہ فکرِ اقبال کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جدید وقدیم، مشرق ومغرب، مذہب وسائنس کے مشترک اقدار کا مجموعہ ہے۔ جو اختلاط وارتباط کے خمیر سے تیار ہوا ہے۔ انسانی فکر کی صدیوں کے سفر کا سلسلہ دراز ہے۔ جو ہمیشہ آگے کی طرف رواں دواں رہتا ہے اقبال نے ''تشکیلِ جدید الہیاتِ اسلامیہ'' کے مقدمہ میں لکھا ہے۔

Our duty is to watch carefully the progress of human thought and to maintain independent critical attitude towards it.

یہ مطالبہ آپ سے بھی ہے کہ اقبال کے فلسفہ وفکر کو حرفِ آخر نہ مان لیں عین ممکن ہے کہ آپ ہی کی صفوں سے دیر یا سویر کوئی مفکر اٹھے اور انسانی فکر کے اس لازوال سلسلے کو آگے بڑھائے۔ بڑھتے رہنا اس کی فطرت ہے۔ ہم نہیں اٹھیں گے تو کوئی اور سبقت لے جائے گا۔

اقبال کے فلسفے کی دوسری خصوصیت اس کا حرکی نظام ہے۔تحرک اس کی سرشت ہے یہ نہ تو جامد ہے اور نہ ساکت یہ سراپا عملی اور حرکی ہے۔صرف تصورات پر قائم نہیں ہے۔یہ تجریدی بھی نہیں ہے۔جو تصورات کے موہوم نگارخانے میں پرورش پاتا ہے۔اور ماورائیت کے آغوش میں گم رہتا ہے۔اس کے برعکس یہ فکر روبہ عمل ہو کر مرئی پیکر کی صورت میں نمود حاصل کرتا ہے۔اقبال نے اسرارِ خودی کے مقدمے میں بڑے پتے کی بات لکھ دی ہے۔ کہ یہ اپنے عمل کی رو سے ظاہر اور اپنی حقیقت کی رو سے مضمر ہے۔یہیں سے تخلیقی فعالیت ظاہر ہوتی ہے۔یہی تخلیقی فعالیت یا عمل و حرکت ان کے فلسفے کی خاص پہچان ہے ان کا خیال ہے عمل پر زندگی کا دارومدار ہے۔اگر یہ مقصدِ حیات نہ ہو زندگی موت سے بدتر ہے۔

ماز تخلیق مقاصد زندہ ایم

انہوں نے آنحضرتؐ کی معراج سے واپسی کو اسی عمل کا نتیجہ قرار دیا ہے۔یہ ان کا اجتہادی نقطۂ نظر ہے۔"The Prophet's return is creative"اور انسان اس تخلیقی عمل میں کسی کا محتاج نہیں بلکہ خود مختار ہے۔خطبات میں درج ہے۔"The man is the trustee of a free personality which he accepted at his peril"

یہ انا عرضا لامانۃ کی طرف اشارہ ہے۔انسان چوں کہ بے پناہ قوتوں کا سرچشمہ ہے اس لئے تخلیق و تعمیر اس کی جوہری صفات میں شامل ہیں۔اقبال کہتے ہیں کہ فطرت نے خاموش فضاؤں میں پہاڑ کے ٹیلے تعمیر کئے ہیں۔قدرت آپ سے توقع کرتی ہے کہ اہرامِ مصر، مسجدِ قرطبہ، اور تاج محل کی تعمیر آپ کریں۔اُس نے زمیں دی ہے۔اُسے گل وگلزار بنانا اور بنی نوع انسان کے لئے سامانِ زندگی فراہم کرنا ہماری ذمہ داری ہے بے جان پتھر بے سبب نہیں ہیں۔خاراتراشی اور خاراگدازی سے عرفان حاصلہوتا ہے۔

آذر کا پیشہ خارا تراشی کارِ خلیلاں خارا گدازی

اگر آپ کے ذہن پر بار نہ ہو تو ذروں یا سنگ ریزوں کی معنویت ملاحظہ فرمائیں کہ لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں۔پتھروں پر ضرب سے معجزات کی دنیا پیدا ہوتی

ہے۔ضربِ کلیمی اور ضربِ ید الٰہی کی تلمیح سے آپ واقف ہیں۔ یہ صرف تلمیح نہیں ہے۔ آپ کی صفت بھی ہے۔ ملاحظہ ہو نظم شاہین کا یہ شعر

ہوائے بیاباں سے ہوتی ہے کاری
جواں مرد کی ضربتِ غاز یانہ

دوسری مثال معراجِ نبویؐ کی ہے۔ اسے اقبال نے تمام انسانوں کے لئے عام کیا ہے۔ جسے شوق اور حوصلہ حاصل ہو وہ چاند سورج کو پامال کرتا ہوا اس نیلے آسمان کو اپنی پرِ پرواز میں لاسکتا ہے۔ عمومیت کی یہ فضا شاعری میں عام ہے۔ بلند پروازی کا عمل اسی تخلیقی نمو کے سبب ہے۔ اقبال نے ہمارے لئے ایک دعا مانگی تھی کہ خدا ہمیں فطرت شناس دل عطا کرے تاکہ ہم اس کے مقاصد کی تکمیل کرسکیں۔

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی

اس مقصد کا قطعی طور پر حاصل یہ ہے کہ کائنات کی اس بیکراں تخلیق کو سنوارا جائے اور انسانوں کی بھلائی کے لئے اس کے قدموں میں ڈال دیا جائے۔

فکرِ اقبال یہیں نہیں ٹھہرتی بلکہ آگے بڑھتی ہے۔ جو اس کی فطرت ہے۔ سنگ ریزے کی سختی اور صلابت کو شسکت دینے کے لئے نرم پتی کافی ہوتی ہے۔ جیسے شاہین کی طاقت کو ختم کرنے کے لئے کبوتر اور مولہ بھی کافی ہے۔ نازک شاخ کی نرم پنکھڑیاں ہیرے کے جگر کو چیرنے کے لئے موثر ہیں۔ غرض فطرت کی کوئی چیز نکمّی یا بے قیمت نہیں ہے۔ مظاہرِ فطرت کی ان چھوٹی سی چھوٹی تخلیق کی حفاظت آدابِ زندگی میں شامل ہے۔ کسی پتی یا پنکھڑی کا بلاسبب توڑنا مسلنا یا روندنا قانونِ فطرت کے خلاف ہے۔ ایسا کرنا فساد فی الارض میں شامل ہوگا۔ قدرت کے ان حسین شاہ کاروں سے بے نیازانہ گزرنا بھی اقبال کے یہاں جائز نہیں ہے۔ ان سے باتیں کیجئے۔ بولیئے اور ہنسایئے۔ مگر زورے نہیں۔ احتیاط شرط ہے۔ کیونکہ اس نے فضا کے آلودہ ہونے کا اندیشہ ہے حد سے گزرنا ہلاکت ہے۔ نازکو بہ اندازِ رعنائی کی اجازت ہے۔

اقبال نے اسی کو ''نفس گُم کردہ'' کہا ہے۔ یعنی سانس روک کر یا سانس باندھ

کر گزرے۔ تاکہ کائنات کی تخلیق میں خلل نہ پڑے۔ ذرا اقبال کی سب سے لطیف اور نازک پیکر تراشی کو دیکھیے کہ پلکوں کی جھپک سے بھی منظر میں خلل یا فساد برپا ہوتا ہے۔

نظارے کو اب جنبشِ مژگاں بھی بار ہے

اگر ہم فطرت کے ان خاموش تقاضوں کو یاد رکھیں تو خوب صورت چمن زار میں تاکیدی تختیوں کی ضرورت نہ رہے۔ یہ تختیاں تو چراگاہوں میں چوپایوں کے لئے بھی نہیں لگائی جاتیں۔ آپ نے دیکھا کہ اقبال کی فکر آغوشِ فطرت کی تربیت یافتہ ہے۔ وہ فطرت کے منشا اور مقاصد سے کتنی قریب ہے۔

ان کی فکر صرف تجربات سے آباد نہیں ہے۔ اسی میں مذہبی مشاہدات کی بڑی کافرمائی ہے۔ تجربات ہی مشاہدات کو مہمیز کرتے ہیں۔ جو مختلف مرحلے طے کر کے وجدان والہام کی منزلوں تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ انسان فکر کا یہی انتہائے کمال ہے۔ ساتھ ہی فکرِ اقبال کی یہ صفت بھی بڑی دل نشینی رکھتی ہے۔ وہ اعلیٰ ترین اقدار کا مجموعہ ہے۔ جلال وجبروت کے ساتھ وہ حسن و جمال کی پرکشش کیفیات کی بھی حامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فکر کو جذبے سے ہم آمیز کردیا گیا ہے فلسفہ محسوسات اور جذبے سے مل کر سوز وگداز میں ڈھل گیا ہے۔ پھر شعری اظہار نے خالص فکر کو جذبے کی زبان بخش دی۔ ہماری مشکلیں بڑھ گئیں کہ ان کے درمیان حد فاصل قائم کرنے کی ہر کوشش رائگاں جاتی ہے۔ فکر کہاں ختم ہوتی اور شاعری کہاں شروع ہوتی ہے یا اس کے برعکس کی صورتِ حال کا تجزیہ بے سود ٹھہرتا ہے۔ شاید اسی سبب اقبال کے تصورات سے اتفاق نہ کرنے والے شاعری کی سحر آفرینی کے جال سے نہیں نکل پاتے۔ چاروناچار اقبال کی عظمت کا اعتراف کرنے پر اپنے کو مجبور پاتے ہیں۔ یہ کہنے میں مجھے کوئی تکلف نہیں ہے کہ فکر ونظر کی گہرائی ہی فن کے دوام ودل نشینی کی ضامن ہوتی ہے۔ دنیائے ادب میں فکر ونظر کے ایسے اثر آفریں اظہار نایاب ہیں۔ اقبال نے فن کا جو قندیل روشن کیا ہے۔ اس سے کسب نور کئے بغیر بڑا شاعر بننا آسان نہیں۔ یہ میری خوش فہمی نہیں ہے۔ سو سال کی ادبی تاریخ میرے مشاہدے کی تائید کرتی ہے۔ حفیظ ہوں یا جوش، فیض ہوں یا فراق ان سب کی عظمتوں کا چراغ اقبال سے نسبت رکھتا ہے۔ یہ

صفِ اول کے شعرا کا حال ہے دوم وسوم درجے کی بات نہیں کرتا۔ تخلیق سے الگ ذرا تنقیدی ادب پر توجہ دیں تو معترف ہوں گے کہ اقبال سے سروکار کے بغیر کوئی بڑا نقاد نہ بن سکا۔ راہِ نجات کے طور پر آخری عمر میں ہی مائل بہ التفات ہوئے۔ معروف محقق پروفیسر گیان چند جین کو کوئی دوسرا موضوع نہ ملا تو روئے تحقیق پر اقبال کا عروضی مطالعہ اور ابتدائی کلام کی کائی کا بے بہا نذرانہ لے کر باریابی حاصل کی ہے۔ ہمارے دوسرے مایۂ ناز محقق ڈاکٹر مشفق خواجہ مرحوم کو دیکھیے کہ پایانِ کار اقبال پر پہلی مطبوعہ کتاب (۱۹۲۳) کو مثالی تدوین وتسوید سے مزین کر کے اقبالیات میں سرخ رو ہوئے۔ تدوین میں خاص امتیاز رکھنے والے محقق جناب رشید حسن خاں بھی کلامِ اقبال کی تدوین وترتیب کی طرف چند سال قبل ہی سنجیدگی سے متوجہ ہوئے ہیں۔ ہمارے دور کے ایک اور محترم محقق پروفیسر سید محمد حنیف نقوی نے باقیاتِ اقبال میں شامل الحاقی کلام کی نشاندہی کر کے اس سیادت میں شامل ہوئے ہیں۔ فنِ تنقید میں حوالے کی حیثیت سے اپنا منفرد مقام رکھنے والے ناقد پروفیسر کلیم الدین احمد نے سن وسال کے آخری ایام میں اقبال پر ایک اہم کتاب پیش کی۔ ''اقبال کا مطالعہ'' فلسفی شاعر کو آفاقی پس منظر میں پرکھنے کی کوشش ہے۔ عہد حاضر کے بیشتر ناقدین اقبال سے آگہی اور التفات رکھتے ہیں مصلحت بھی یہی کہتی ہے کہ مکتب سے دانش گاہوں تک متعارف ہونے کے لئے اقبال کے احوال ومقام سے وابستگی ضروری ہے۔ مشکل یہ آن پڑی ہے کہ علامہ نے جو میزان ومعیار دیا ہے اسے عبور کرنا تو کجا اس تک رسائی بھی عام ذہن رکھنے والوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ اقبال کی پیروی ایک ناممکن عمل ہے۔ کتنے فن کار اس نیاز مندی میں اپنا وجود کھو بیٹھے۔ میں نے سو سال کی بات کہی ہے۔ شاید آپ کے دل میں ہو کہ ابھی تو اقبال کے انتقال کو تقریباً 65 سال ہی ہوئے ہیں۔ راقم آپ کو یاد دلاتا ہے۔ کہ اقبال کی شاعری کے ابتدائی دور کی نظم ''ترانۂ ہندی'' ہے جو ۱۹۰۴ء کی تخلیق ہے۔ اس وقت تک اقبال کا نہ تو کلام پختہ ہوا تھا اور فکر کی صبح ہی نمودار ہوئی تھی۔ گویا کل 27 سال کی عمر میں یہ نظم لکھی گئی۔ آج تک اردو ہی کیا ملک کی کسی دوسری زبان میں بھی ایسی نظم نہ لکھی جاسکی۔ اسے چھوڑیے۔ اسی دور کی دوسری نظم دعا ہے۔ ابھی تک ''لب پہ آتی

ہے دعا بن کے'' اس کا بھی جواب نہ آسکا۔ زندگی کو شمع کی صورت کہنے اور برتنے کے لئے آنکھیں ترس گئیں۔ ہم نے احتجاج وانقلاب کو صبح وشام کا وظیفہ تو سمجھا مگر آپ انصاف سے کہیں کہ کیا اقبال کے اس شعر کا جواب اب تک کسی سے بن پڑا۔

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اقبال کو معتوب قرار دینے والے ناقد مجنوں گورکھپوری نے ہی لکھا ہے کہ انقلاب کا ایسا نعرہ مارکس اور لینن بھی نہ پیش کر سکے۔ یہ تو شعراء کی بات تھی۔ ان کے علاوہ دوسرے طبقوں کے لئے بھی اقبال ناگزیر حیثیت رکھتے ہیں۔ مذہبی علماء بھی اقبال سے اختلاف رکھنے کے باوجود اقبال سے مفر نہیں پا سکتے۔ اقبال کے معیار ومنہاج کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ سید سلیمان ندوی، سید ابو الاعلی مودودی، یا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا خمینی سے بڑا اور بالغ نظر کون ہوا۔ سب اقبال کی اجتہادی فکر کے قدردان اور صدقِ دل سے معترف تھے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے ''تفسیرِ ماجدی'' میں سورہ شعراء کی آیت کریمہ ''والشعراء یتبع ......'' کے ضمن میں لکھا ہے کہ حضرت حسان بن ثابتؓ اور علامہ اقبال کی شاعری اس ذیل میں نہیں آتی۔

اساتذہ وافسران کے ساتھ رہ نمایانِ قوم پر بھی نظر ڈالی جاسکتی ہے۔ ناچیز کا خیال ہے کہ برصغیر کی مسلم دانشوری کا انحصار بہت کچھ اقبال پر ہے۔ گذشتہ صدی کی صدائے بازگشت کئی صدیوں تک آواز دیتی رہے گی۔ یہ ثابت ہے کہ ہم اقبال سے انکار کر کے اپنی توقیر نہیں بڑھا سکتے اور نہ سرخ رو ہو سکتے ہیں۔ مستقبل میں بھی ہمارے ویژن اور وجدان کا سرچشمہ اقبال ہی ہوگا۔ بیسویں صدی کے مختلف میدانوں میں نمایاں مقام حاصل کرنے والوں کی بڑی تعداد اقبال کے نیازمندوں کی ہی ہے۔ ہم اقبال کے اثرات سے بے نیاز نہیں رہ سکتے۔ مسلم معاشرے اور اس کی پوری فکر پر بہ قول پروفیسر کینٹول اسمتھ کے بہت نمایاں اثر اقبال کا ہی ہے۔ اسی کے فیض سے سب کی نگاہ ہے روشن۔

اقبال کو صرف شاعری کے وسیلے سے سمجھنا قدرے دشوار بھی ہے یا انھیں صرف شاعر

سمجھ لینا مغالطہ پیدا کرسکتا ہے۔ بہ قول پروفیسر رشید احمد صدیقی یہ تصور کرنا بھی غلط ہوگا کہ ان کے تمام خیالات ان کی تحریروں میں منتقل ہوگئے ہیں۔ ایک سنجیدہ طالب علم کو محسوس ہوتا ہے کہ اقبال کو بہت کچھ کہنا تھا۔ کاش انھیں تھوڑا اور وقت ملا ہوتا یا فکرِ معاش سے آزاد ہوتے تو ہمیں اور کچھ دے گئے ہوتے۔ کیا یہ المیہ نہیں ہے کہ وہ روٹی کی خاطر عدالتوں کی خاک چھانتے رہے۔ ان کی غیرت کو ٹھیس پہچانے کے لئے ایک ہزار روپے کا چک دیا گیا جسے انھوں نے خدائی کی زکوۃ کہہ کر واپس کردیا نظام رہے نہ ریاست کلامِ اقبال باقی ہے اقبال کے مطالعہ میں یہ ایک دل دکھانے والی کہانی ہے۔ ان سب تکلیفوں کے باوجود ان کے استقلال پر حرف نہ آیا۔ اگر چہ سینے میں ایک پیکار برپا تھا۔ جو دہکتی آگ کی طرح جسم وجان کی قیمت مانگتا رہا۔ وہ اپنے پڑھنے والوں سے کہتے رہے کہ ذرا میرے دل میں جھانک کر تو دیکھو۔

یک لحظہ بدل در شو شاید تو درای

ان کے اضطراب کی مختلف صورتیں پردہ پوشی کے احتیاج کے باوجود ظاہر ہوتی رہیں۔ ان سے زندگی کی سرگذشت لکھنے کی فرمائش کی گئی تھی۔ اقبال نے جواباً لکھا تھا۔

"It is useless to mention as to when and where I graduated. The great mental conflict which I had to pass throughout is more important"

یہ اضطراب فکر ونظر کے ٹکراؤ کی صورت میں بھی نمایاں ہے۔ ان کا دور فکری آشوب کے ساتھ تہذیبی تصادم کی کشاکشوں سے دو چار تھا۔ کسی بھی حساس انسان کے لئے مذہب وسائنس یا روح ومادہ جذبہ وفکر، مشرق ومغرب کے ثقافتی اور سیاسی تصورات کے درمیان مطابقت کی کوشش صبر آزما مرحلہ ہوتا ہے۔ فکرِ اقبال میں ان ٹکراؤ اور مفاہمت کا ایک سیلاب ہے۔ عقل وعشق، جدید وقدیم، خودی وبے خودی، خلافت وجمہوریت، جلال وجمال سے ہم آہنگ ہونے کے لئے مضطرب ہے۔ اقبال نے ان میں اعتدال کی راہ پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ اس میں انھیں تنقید کا ہدف بھی بننا پڑا۔ ہم آپ اقبال کے زمانے سے کہیں زیادہ

آج اس کشمکش سے دوچار ہیں۔ اقبال نے اپنی بصیرت سے اس آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ لی تھی۔ جس کی ضرورت سو سال بعد بھی محسوس کی جارہی ہے۔ کیا آپ نے محسوس کیا آج کی متمدن دنیا کو اقبال کے تصورات ناگزیر بن گئے ہیں۔ ایشیا کے چند مسلم ممالک کی بیداری اور بے چینی پر اکتفانہ کریں۔ کچھ ذاتی واقعات پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ ایک خوش گوار موقع پر جنوبی افریقہ کے مسلم نوجوانوں سے تبادلۂ خیالات کا موقع ملا۔ محسوس ہوا کہ انھیں اقبال کے اشعار وخیالات سے خاصی دلچسپی ہے۔ ۱۹۸۶ء میں لیبیا کے اساتذہ اور صدر مملکت جناب کرنل قذافی سے گفتگو کے دوران اقبال کا ذکر آیا تو موصوف بھی علامہ سے متعارف نظر آئے۔ اقبال کی نظم فاطمہ بنت عبداللہ کے عربی ترجمہ کی بات تھی جس میں ۱۹۱۲ء میں فاطمہ مرحومہ کا طرابلس کے میدانِ جنگ میں غازیوں کو پانی پلاتے شہادت کا ذکر ہے۔ ۱۹۹۹ء میں بین الاقوامی اقبال کانفرنس میں ماریشس کے صدر جناب اُتیم کے خطبۂ صدارت میں اقبال کے خیالات موج در موج بن کر متاثر کر رہے تھے۔ اگست ۲۰۰۳ء کی عالمی اردو کانفرنس کے موقع پر وہاں کی یونیورسٹی کے استاد احمد رحمت علی نے اپنے مقالے میں اقبال کو ہی ماریشس کا سب سے مقبول شاعر قرار دیا۔ اس سہ روزہ کانفرنس میں علامہ کے اشعار تحریر وتقریر میں گونجتے رہے۔ ہندوستان کے ایک پروفیسر نے اپنے مضمون میں دانستہ طور پر اقبال کو نظرانداز کیا تھا اسے اچھی نظروں سے نہیں دیکھا گیا۔ ۱۹۸۰ء میں مرحوم جنرل ضیاء الحق سے ایوانِ صدر میں عشائیہ پر گفتگو کے دوران محسوس ہوا کہ ان کے ساتھ ان کے دست راست پروفیسر بروہی اقبال کے تصورات سے سرشار ہیں۔ اردو کے کئی اساتذہ گفتگو میں شامل تھے۔ آتشِ چنار کے مصنف شیخ عبداللہ کی اقبال سے والہانہ عقیدت کے ہم سب معترف ہیں۔

آپ میرے تاثرات کو خوش فہمی قرار دے سکتے ہیں اس لئے کہ ان کی کوئی سند نہیں ہے۔ Span امریکہ کا سرکاری رسالہ ہے۔ پچھلے برس کے ایک شمارے میں Visionaries under 30th کے عنوان سے مضمون میں وہاں کے نوجوانوں کی اقبال سے گرویدگی کا بہ طور خاص ذکر ہے۔ ہم نے اس پر ابھی غور نہیں کیا ہے کہ ۱۹۷۶ء میں ہندوستان کی آنجہانی وزیر اعظم کی اقبال سے دلچسپی کا کیا سبب تھا؟ معلوم ہوا کہ وہ سب

کے لئے ناگزیر ہیں کیونکہ کہ اقبال بنی نوع کے لئے دستور ساز پیغام پیش کرتے ہیں۔ان کا خطاب مشرق ومغرب، مسلم وغیر مسلم کے امتیازات سے ماوراسورج کی روشنی کی مانند ہے۔ ان کا شعر و پیغام تقدیر سازی کے روشن امکانات کی بشارتوں کی طرف بلاتا ہے۔

بنتے ہیں مری کارگہِ فکر میں انجم
لے اپنے مقدر کے ستارے کو تو پہچان

جنرل ایوب خاں نے اپنی کتاب کا نام ''جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی'' ہی رکھا ہے۔ ہندوستان کے دوسرے فلسفی صدر سروپلی ڈاکٹر رادھا کرشنن نے اپنی مایۂ ناز کتاب میں ہندوستانی فلسفہ کے ذیل میں اقبال پر ایک باب قائم کیا ہے۔تیسرے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین کو اقبال بہت عزیز تھے۔انھیں کے اشعار گنگناتے تھے۔موجودہ وزیر اعظم ڈاکٹر من موہن سنگھ کو بھی کلامِ اقبال سے بڑی دلچسپی ہے۔ پہلے وزیر اعظم آنجہانی پنڈت نہرو بھی اقبال سے بہت متاثر تھے ان کے علاوہ کتنے اکابرین ہیں جن کے دلوں میں اقبال شرارِ آرزو بن کر مچلتے رہے ہیں۔ ملک کی چھ بڑی دانش گاہوں میں اقبال کو اعزازی ڈگری کا تفویض کیا جانا بھی ان کی جلیل القدر علمی خدمات کا اعتراف ہے۔ کشمیر وحیدر آباد کے علاوہ مارکسی ریاست کلکتہ میں اقبال چیر کا قیام بھی اسی اعتراف کی روشن دلیل ہے۔بیسویں صدی کے دو بڑے فن کار جوش وفیض کا منظومِ تحسین بھی عمومی اثرات کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔

دلِ طورِ سینا وفاراں جس تجلی کی منتظر ہے وہ امانت آپ کے سینوں میں محفوظ ہے۔ اس کی شوخیٔ اظہار کا یہی مناسب وقت ہے۔ پوری انسانیت اس لازوال پیغام کے انتظار میں ہے۔اس کے لئے آپ کو ہی گامزن ہونا پڑے گا۔ کیونکہ اقبال کے مخاطبِ اول آپ ہی ہیں۔آپ سے قیام کا مطالبہ ہے۔سجود کا نہیں۔اقبال نے خبردار کیا ہے۔

یہ ناداں جھک گئے سجدے میں جب وقتِ قیام آیا

اقبال کے یہ تابندہ تصورات انسانوں کی مشترک میراث ہیں یہ کسی ایک قوم کی ملکیت، یا مالِ غنیمت نہیں جو صرف مجاہدوں اور غازیوں کے لئے ہی مخصوص ہو۔اقبال نے فکر وآگہی کی اس دولتِ بیدار کو انسانوں کے قافلے میں لٹادینے کے لئے آپ کو ہدایت دی

ہے۔ بخل اور بے انصافی نہ کیجئے۔ دنیا آپ کی فرض شناسی کی منتظر ہے اور محتاج بھی۔ فکروادب میں اقبال سے بڑا عظمتِ آدم کا معترف اور نغمہ سرا کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ یہی انسان ان کی فکرونظر کا نقطۂ پرکار حق ہے۔ اور مرکزِ محسوس بھی۔ یہ آواز دوسری جگہ نہیں سنائی دیتی۔

باخبر شواز مقامِ آدمی

یا

برتر از گردوں مقامِ آدم است
اصل تہذیب احترامِ آدم است

یا

خدا خود در تلاشِ آدم ہست

عظمت و رفعت اور جرأتِ اظہار کی ایسی بے باکی انقلابی فکر کے کسی حامی اور حمایتی کو بھی نصیب نہ ہوئی۔ یہ بڑی باتیں کہنے کے لئے جزاوسزا سے بے نیاز ہوکر آتشِ نمرود میں اترنا پڑتا ہے۔ آگ میں تپنے کے بعد ہی باپ بیٹے سے قربانی طلب کرتا ہے۔ بیٹے نے بھی باپ کے خواب کے لئے بے چوں و چرا نیزے کے نیچے سرِ نیاز رکھ دیا۔ شہادت اور سعادت کے لئے دونوں صفحۂ گردوں پر اپنا نام روشن کر گئے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہم آپ اقبال کے مطالبے کو کب پورا کر کے سربلند ہوتے ہیں۔ بزمِ جہاں کے انداز بدل دینے کے لئے اقبال نے آپ پر ذمہ داری عائد کی ہے۔ ان کی پیشینگوئی تھی کہ مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہوگا اور آپ کے بغیر دنیا کا تلاطم اور طوفان نہیں رک سکتا۔ آپ کے لئے ہی اقبال نے لکھا ہے۔

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا — اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا
خیز وقانونِ اخوت ساز دہ — جامِ صہبائے محبت ساز دہ

کیا آپ محسوس نہیں کرتے کہ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقتوں کے ایوانوں میں بھی آپ کے اندیشوں سے زلزلہ طاری ہے۔ طاقتوں کی سرپرستی میں کچھ تہذیبیں عظیم انسانی اقدار کو مٹادینے کیلئے برسرِ پیکار ہیں۔ پروفیسر سموئل ہن ٹنگٹن اپنی تمام طرف داری کے

باوجود تہذیبی تصادم میں اس طرف بھی دبی زبان سے اشارہ کرتا ہے۔ تقریباً سو سال قبل اشپنگلر کی کتاب ''زوالِ مغرب'' شائع ہوئی تھی۔ جس کا اقبال نے بھی بغور مطالعہ کیا تھا اور اعلانیہ کہا تھا کہ مغربی تہذیب اپنی موت مرے گی۔

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے

اس وقت بھی اقبال کے مخاطب آپ ہی تھے۔ اور جستجو بھی آپ کی تھی۔ بحروبر پر کمندیں ڈالنے والے انسان کی تلاش کا سفر ۱۹۱۳ء سے جاری ہے۔ اس فکری سفر کی ابتداء ''اسرارِ خودی'' کے سرنامۂ کتاب پر جلی حرفوں میں درج ہے۔ اقبال فکر و نظر کا چراغ لے کر زمانے کے اندھیروں کو اجالوں میں بدلنے کے لئے دردر بھٹکتے رہے۔

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر
کز دام و دد ملولم وانسانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

آرزوئے ناتمام کی خواہش ان کے لئے خلش بن چکی تھی۔ شعلۂ زندگی کو دھواں بننے سے روکنے کیلئے اقبال کے نزدیک یہی تریاق ہے۔ یہی دل ونظر کے چراغ کو فروزاں رکھتی ہے۔ آپ کیلئے ہی اقبال نے یہ نسخہ بیاضِ مسیحا سے فراہم کیا ہے۔

از شعاعِ آرزو تابندہ ام

آرزوں کے سہارے خواب جنم لیتے ہیں۔ اور خواب ہی تعبیر و تکمیل کے لئے ہمیں اُکساتے اور آمادہ کرتے رہتے ہیں۔ یہ خواب بھی آپ کی تخلیقی فعالیت کے زیرِ سایہ پرورش پاتے ہیں۔ خود اقبال پر نظر ڈالیے۔ انھوں نے ایک خواب ۱۹۲۳ء میں دیکھا تھا۔

پھر اُٹھی ایشیا کے دل سے چنگاری محبت کی
زمیں جولانگہ اطلس قبایانِ تتاری ہے

اس خواب کو پورا ہونے میں تقریباً اقبال کی پوری عمر درکار تھی۔ پینسٹھ سال بعد ۱۹۹۱ء میں اس کی تکمیل ہوئی۔ ۱۹۳۰ء کا خواب بھی حرف بہ حرف پورا ہوا۔ ۱۹۳۳ء کا خواب

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے

بھی شرمندۂ تعبیر ہوا۔ اس زمانے کے دوسرے خواب کی تکمیل کے لئے اقبال آپ سے مخاطب ہیں۔

آبِ روانِ کبیر تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب
عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب

سینہ کائنات کا یہ رازِ اربابِ جنوں کے دلوں میں نفسِ جبریل بن کر اتارا جا چکا ہے۔ یہی رازِ حقیقتِ ابدی ہے۔ باقی سب فتنے ہیں یا فسانے۔

وہ حرفِ راز کہ مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں
خدا نفسِ جبرئیل دے تو کہوں

اقبال کا شعری آہنگ

یہ ایک ریڈیائی تقریر تھی جو مضمون کی صورت میں برصغیر کے کئی رسالوں میں شائع ہوئی شعرِ اقبال کی تفہیم میں یہ کوشش ایک نئے زاویہ کی طرف ایک ادنی کوشش ہے۔ جس کے اور بھی پہلو تفصیل کے متقاضی ہیں۔ مجھے مسرت ہے کہ اردو کے سب سے معروف نقاد پروفیسر کلیم الدین احمد نے اس مضمون کو قابل اعتنا سمجھا اور انھوں نے اپنی قابل قدر تصنیف ''اقبال کا مطالعہ'' میں اس کا حوالہ دیا۔ اگر چہ ان کا رویہ تنقیدی ہے اور میرے مباحث سے اختلاف کی صورت میں ہے۔ پھر بھی یہ میرے لیے باعثِ سعادت ہے کہ انھوں نے ''مسجد قرطبہ'' پر تجزیہ کا آغاز اسی مضمون کے حوالے سے کیا ہے۔ وہ ایک بزرگ نقاد ہیں۔ اور یہ کتاب ان کی عمر بھر کے مطالعہ کا حاصل۔ کتاب بڑی حد تک مایوس کن ہے۔ وہ بہت سی سچائیوں کے ساتھ اقبال کو بھی صحیح سمت میں سمجھنے اور پیش کرنے سے قاصر رہے۔ یہی صورت حال یہاں بھی ہے۔ انھوں نے فکر کی باطنی تنظیم اور آہنگ کی اندرونی کیفیت سے انکار کیا ہے۔ حالاں کہ اقبال کے فکر و شعر کے رشتے کو سمجھنے میں یہ ایک کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ اور ان کے شعری آہنگ کی ترتیب میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ لفظوں، مصرعوں، اشعار اور بند کے پیچھے ایک زبردست فکری آہنگ ہے۔ جو لفظ و معنی کے ارتباط کو زیادہ سے زیادہ مؤثر بناتا ہے۔ اقبال کے ہاں نہ تو ریزہ خیالی ہے اور انتشارِ ذہنی۔ سب کچھ

ایک مربوط نظامِ فکر اور تسلسلِ اظہار سے وابستہ ہے۔ یہی چیزیں ان کے آہنگ کو سیلابِ رواں کی مانند تیز وتند بناتی ہیں۔ آہنگ کی یہی رواں دواں کیفیت شعرِ اقبال میں جاری ہے۔ تخلیق کی اس پُر اسرار رفعت کو سمجھنے کے لیے فکر وشعر کے رشتے کو سمجھنا ضروری ہے۔ جو اقبال کا ہی سرمایۂ افتخار ہے۔

اقبالیات میں یہ گفتگو ابھی ناتمام ہے کہ اقبال کی حیثیت فسلفی شاعر کی ہے۔ یا شاعر فلسفی کی۔ ان موضوعات میں تقدیم وتاخیر کا ہی فرق نہیں بلکہ دونوں متضاد ہیں اور ان کے نتائج بھی مختلف النوع ہیں اقبال شناسوں کے درمیان اختلافِ گفتگو موجود ہے۔ قارئین بھی کسی فیصلہ کن نتیجہ پر نہیں پہنچ سکے ہیں۔ اگرچہ اقبال کی شخصیت، فکر اور شاعری پر دوسرے فن کاروں کے مقابلے میں ان کی رائے زیادہ دوٹوک نظر آتی ہے۔ اس بحث میں اقبال کی ہی نہیں بلکہ اس تہذیب کی بھی توہین ہے۔ جس کی اقبال ترجمانی کرتے رہے۔ اس فکر کی بھی اہانت ہے جو قوموں کی تقدیر بدل دینے کا حوصلہ رکھتی ہے شاعر محض تسلیم کر لینا بھی ان کی عظمت وآفاقیت کے منافی ہے۔ اقبال کے یہاں دونوں پہلوؤں کا اظہار موجود ہے لیکن مجموعی طور پر انھوں نے اپنی مفکرانہ حیثیت پر زیادہ زور دیا ہے۔

کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ مے خانہ
ہے فلسفہ میرے آب وگل میں

خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگر دانائے راز آید کہ ناید!

جیسے فکر انگیز بیان زیادہ توجہ چاہتے ہیں اور انھیں آسانی سے نظر انداز بھی نہیں کیا جانا چاہئے۔

اقبالیات کے مطالعہ سے یہ بات ذہن نشین ہوتی ہے کہ وہ فن پر خاطر خواہ متوجہ نہیں ہیں۔ ان کی بعض اہم نثری تحریوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں فنِ شاعری سے کم دلچسپی ہے اور انھوں نے چند خاص مقاصد کے بیان کے لیے شعری اسلوب اختیار کیا ہے۔ ان کے نزدیک حقائق ملی اور اخلاقی ہیں۔ فن یا زبان وبیان یا طریقِ اظہار ثانوی ہے۔ انھوں

نے فکر و پیغام کی ترجمانی یا حقائق کی ترسیل کے لیے ملکی وقومی روایات سے متاثر ہو کر شعری اسلوب کو پسند کیا۔

قارئین اقبال کو معلوم ہے کہ ان کے کلام میں فکر و پیغام سے خالی اشعار کی تعداد بہت کم ہے۔ خاص طور پر فلسفیانہ شخصیت کے اظہار یعنی اسرارِ خودی ۱۹۱۵ء کے بعد تو فکر سے عاری اشعار معدوم ہوتے گئے۔ ان کی توجہ فنی حسن آفرینی سے ہٹتی اور فلسفہ و فکر پر مرتکز ہوتی گئی۔ ان کی فلسفیانہ شخصیت کی نمود اور اظہار ہر محاذ پر غالب اور پورے فن پر سایہ نشین ہے۔ فلسفہ پر ان کی توجہ روز افزوں ہے۔ حد یہ ہے کہ وہ اب اصلاحِ شعر کی طرف بھی کم مائل ہیں باقیات و اصلاحات کے مجموعوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ''بانگِ درا'' کے مقابلہ میں دوسرے شعری مجموعوں میں کلام پر فنی نقطۂ نظر سے نظر ثانی کم سے کم تر ہوتی گئی۔

دراصل یہ معجزۂ فن کی نمود ہے کہ ان کا فن بھی عظمت و عروج کی ان بلندیوں پر پہنچا۔ جہاں فارسی اور اردو کے دوسرے شعراء کی رسائی ممکن نہ ہو سکی۔ اقبال کے کمالِ ہنر کی انتہا اور معراج بھی یہی ہے۔ فلسفہ و فکر کی گہرائی لطافتِ فن سے اس طرح ہم آہنگ ہے کہ دنیائے ادب میں کوئی دوسری نظیر نہیں ملتی۔ اسی امتزاج وارتباط پر ان کی عظمت اور آفاقیت کا انحصار ہے۔

فلسفہ و شعر کا ایک دوسرے سے ہم دوش یا ہم نشیں ہو جانا دراصل دونوں کی معراج ہے۔ اقبال کے دیئے ہوئے اسی معیار و منہاج پر آفاقی شعر و ادب کا تقابلی تجزیہ ممکن ہے۔ یہی آہنگ وارتباط تخلیقی فن پاروں کو پرکھنے کا اصل الاصول قرار پا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ برصغیر کے مفکر شاعر کی اس تہذیبی بلندی و برنائی کو ہم ابھی تک پورے طور پر نہ سمجھ سکے ہیں اور نہ پیش کر سکے ہیں۔ عالمی اور دوامی شہرت رکھنے والے کسی فن کار کو اقبال کے روبرو نہیں لایا جا سکتا۔ کیونکہ کسی ایک کے ہاں فکر و فن کا ایسا دل نشین مرکب موجود نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی فن کی تازہ کاری میں اقبال سے سبقت لے جائے مگر فکر کی بلندی و تہ داری میں بہت ہی کوتاہ قد نظر آئے گا۔ اقبال کے ہاں یہ امتزاج جوہری توانائی کی طرح بے کراں ہے۔ ان کے پیغام کے خلاف احتجاج کیا گیا۔ قوم پرستوں اور ترقی پسندوں نے اقبال کو کیا کچھ نہیں کہا ان کی پیغمبرانہ شخصیت کو پامال کرنے اور اقبال کے خلاف نفرت پیدا کرنے میں کوئی

دقیقہ نہیں چھوڑا گیا۔ مگر اقبال کے فن کی فسوں گری نے سب کو بے اثر بنا دیا اور جب کبھی زبان و بیان کی غلطیاں زیر بحث آئیں تو فکر کی عظمت کے سامنے ٹھہر نہ سکیں۔

اسی حسنِ امتزاج کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اقبال کے فن پر گفتگو کرتے وقت ان کے فلسفہ وفکر کا ذکر کرنا گزیر ہو جاتا ہے۔ افہام و تفہیم کی سادہ و رنگین راہیں پُر پیچ و پُر خطر بن جاتی ہیں۔ شارح و سامعین دونوں حیرت فروش دکھائی دیتے ہیں۔ اقبال کے شعری آہنگ پر آپ سے مخاطب ہوں مگر اس عجز اور اعتذار کے ساتھ کہ دورانِ گفتگو فلسفہ وفکر کا تذکرہ آ جائے تو درگذر کیجئے گا۔

فلسفہ و شعر کی جس آمیزش یا ارتباط کا ذکر کیا گیا وہ بے محل یا طوالانی تمہید نہیں بلکہ یہی اقبال کے شعری آہنگ کا سرچشمہ یا مینارۂ نور ہے۔ اسی امتزاج سے نغمے پھوٹتے اور بکھرتے ہیں۔ ان میں سوز و گداز کی زیریں لہریں کارفرما ہیں ساتھ ہی جلال و جبروت کی پروقار آوازیں بھی اس آہنگ کو حیرت خیز بناتی ہیں۔ آہنگ کی اس نقش گری میں تینوں زاویے انتہائی چست اور مربوط ہیں۔ خیال کی فکر انگیزی کو الفاظ کی صورت میں ڈھال کر صوت وصدا سے آراستہ کیا گیا ہے۔ گویا خیال، لفظ اور آواز تینوں ہم راز بن کر آہنگ کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ اسی مربوط نظام سے ان کا آہنگ شعر ایک منفرد لب ولہجہ اختیار کرتا ہے اور دوسرے فن کاروں سے ممتاز یا متمائز ہوتا ہے۔ آہنگ کی ترتیب میں فکر و خیال سب سے زیادہ متحرک آلۂ کار کی صورت رکھتے ہیں۔ فکر کی تنظیم سے آہنگ کی ترتیب اور تاثیر ممکن ہوتی ہے۔ جب خیال منتشر اور غیر مرتب ہو تو آہنگ بھی بکھر کر بے اثر ہو جاتا ہے۔ لفظوں کی موزونیت اور صوتی حسن تو مل سکتا ہے مگر آہنگ کا بنیادی مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ آہنگ دامنِ احساس کو مس ہی نہیں کرتا بلکہ اسے مہمیز بھی کرتا ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو وہ آہنگ تشنہ اور تکمیل طلب ہے۔ صرف مترنم لفظوں کے انتخاب سے پیدا ہونے والا آہنگ وقتی اور طلسماتی ہو کر رہ جاتا ہے نہ وہ دیرپا ہو سکتا ہے اور نہ ہمارے حواس و مدرکات کو گرفت میں لا سکتا ہے۔ خیال کی سطحیت کو الفاظ کے گورکھ دھندوں میں چھپانے کی کوشش سے آہنگ عنقا ہو جاتا ہے۔ جوش کی شاعری کو پیش نظر رکھئے تو اندازہ ہوگا۔

اقبال کا شعری آہنگ حرف وصوت پر مشتمل ضرور ہے۔ مگر وہ فکر کی گہری معنویت اور تہ داری سے قوت حاصل کرتا ہے جس سے وہ اتنا ہی خیال افروز بن جاتا ہے۔ یہ آہنگ ہمارے قلب ونظر کی دنیا کو اپنے ساتھ لے کر چلتا ہے۔ ہم فکرِ اقبال سے تھوڑی دیر کے لیے غافل بھی ہو سکتے ہیں مگر ان کا آہنگ ہمیں بیدار رکھتا ہے اور ہمیں بھٹکنے نہیں دیتا۔ خیال الفاظ میں منتقل ہوتا ہے۔ فکر کے متحمل الفاظ ذہن پر خیال وفکر کے پیکر مرتسم کرتے ہیں۔ آہنگ خیال واظہار کے درمیان ایک سیل رواں کی صورت دونوں کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔ اسی وجہ سے اقبال کے فلسفہ وفکر کی ترسیل ناکامیوں سے دوچار نہیں ہوتی بلکہ بھرپور اور بے حجاب ہوتی ہے۔ خیال کی ترسیل وترجمانی کے ضمن میں اقبال سب سے زیادہ کامیاب نظر آتے ہیں کیونکہ انھیں خیال کے برملا اور بے کم وکاست اظہار پر بڑی قدرت حاصل ہے۔ ایک عظیم فن کار کی طرح لفظ کو خیال کی بھرپور ادائیگی کا متحمل بنا دینا ان کے لیے بہت آسان ہے۔ ان کے تصورات مرتب اور ان کی بصیرت وآگہی مدتوں کی ریاضت سے وجود میں آئی ہے۔ اس لیے انھیں دشواری محسوس نہیں ہوتی۔ خیالات کا تلاطم یا تموج اسلوبِ گفتار کی پرواہ نہیں کرتا۔ ایسی صورت میں الفاظ کا حسنِ انتخاب ان کا دربست مستحکم ہوتا ہے۔ صوتی نظام میں تصنع یا ترصیع بندی کی ضرورت پیش نہیں آتی بلکہ یہ تخلیقی اظہار کا جز بن جاتے ہیں۔ ان کا شعری آہنگ بھی اسی تخلیقی فعالیت سے سیراب ہوتا ہے۔ اس وجہ سے آہنگ افکار کے سیل کا جز بن کر رواں دواں ہوتا ہے۔ نظموں سے قطع نظر اردو اور فارسی غزلوں میں بھی یہ کیفیت اپنی غایت کو پہنچی ہوئی ہے۔ آہنگ کی یکساں اور رواں کیفیت کی وجہ سے ان کی نظموں اور غزلوں کا فرق محسوس نہیں ہوتا۔ دونوں کی خوبی وخوش نمائی ایک جیسی معلوم ہوتی ہے۔ 'زبورِ عجم' کی غزلیں ہوں یا 'بالِ جبریل' کی آہنگ کے سیل سے سرشار ہیں۔ مثال کے لیے ایک غزل کے تین اشعار ملاحظہ ہوں۔

از چشم ساقی مست شرابم — بے مے خرابم بے مے خرابم
شوقم فزوں تراز بے حجابی — بینم نہ بینم در پیچ وتابم
از من بروں نیست منزل گہ من — من بے نصیبم راہے نیابم

صرف صوتی تکرار یا ہم آواز لفظوں کے استعمال سے آہنگ کی اس مترنم کیفیت کی

تخلیق نہیں کی گئی ہے بلکہ الفاظ کو فکر و خیال کا بھرپور متحمل اور مکمل اظہار کے لیے ترسیل سے معمور کیا گیا ہے۔ مفہوم کی باطنی تنظیم سے آہنگ کی تشکیل ہو رہی ہے اور یہ تشکیل رفتہ رفتہ منتہا کی طرف بڑھتی ہے۔ آہنگ کی انتہا پیغام کے عروج پر ختم ہوتی ہے۔ 'بالِ جبریل' کی مکمل اور آہنگ کی انوکھی کیفیات کی نمائندہ غزل:

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن

کے ابتدائی اشعار کو لیجیے اور آخری شعر تک آہنگ کے تدریجی بہاؤ کو سامنے رکھیے۔

تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

غزلوں میں بھی ان کا آہنگ انتشار یا فرد فرد خیال کی جگہ مسلسل اور مربوط ہے ایک کیفیت ایک تاثر اور ایک لے ملتی ہے۔ آہنگ کی اندرونی تنظیم خارجی ترتیب سے بیگانہ نہیں ہونے پاتی۔ لفظ و معنی کے گہرے رشتہ پر مبنی یہ آہنگ انوکھا اور حیرت انگیز ہے۔ الفاظ ترسیل کی ناکامی کا احساس پیدا ہونے نہیں دیتے۔ کیونکہ آہنگ درمیان میں حائل حجاب کو دور کر دیتا ہے۔ اگر آہنگ کے مجموعی تاثر کو ذہن میں رکھیں تو یہ حقیقت بھی آشکار ہوگی کہ اقبال کے یہاں آہنگ اظہار کے لیے ایک موثر وسیلے کا کام انجام دیتا ہے۔ آہنگ جب اس منزل پر پہنچ جائے تو سمجھیے کہ یہ اس کی سب سے بڑی معراج ہے۔ پانچ اشعار پر مشتمل 'بالِ جبرئیل' کی دوسری غزل کو ملاحظہ فرمائیں'

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

فکر کے ساتھ آہنگ سادہ و عام الفاظ کے سہارے آخری شعر پر اس طرح ختم ہوتا ہے:

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا

ہم جانتے ہیں کہ اردو شاعری اقبال کے گوناگوں اکتسابات سے ہمیشہ زیر بار رہے گی اقبال کو اظہار کے سانچوں میں بے پناہ توسیع اور فکر کی ابلاغ کے لیے بلاشبہ نئی زبان اور نئے اسالیب تخلیق کرنے پڑے۔ جسے صرف عبقری ذہن ہی انجام دے سکتا ہے۔ اقبال

نے ایک طرف مروج الفاظ وعلامتوں کو نئی فکر اور نئے خیال سے آراستہ کیا۔ دوسری طرف ان کو نیا رنگ و آہنگ بھی دیا۔ ان الفاظ کی ترتیب، اجتماعیت اور معنی کی پیوستگی کی کیفیت نے آہنگ کو اور بھی نغمگی دی۔ درد و داغ، سوز و ساز، جستجو و آرزو، قلب و نظر، عقل و خرد، حسن و عشق خودی و بے خودی فقر و غنا جیسے سینکڑوں الفاظ مفہوم کی نئی دنیا سے دو چار ہوئے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ اپنے روایتی مفہوم سے دست بردار ہوئے۔ ان پر قارئین کی نگاہ بار بار ٹھہرتی ہے۔ ذہن بھی دامن کشاں ہو کر نہیں گزرتا۔ بلکہ بصیرت و آگہی کے عالم نو کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔ اس سے قطع نظر یہ الفاظ اقبال کے آہنگ کی اندرونی تشکیل میں معاون ہوتے ہیں۔ الفاظ ترسیل کے طلسم کو توڑ کے آہنگ کے سوز و گداز میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ الفاظ پگھل کر خارجی ہیئت کھو بیٹھتے ہیں صرف آہنگ کا معنوی جذب و شوق باقی رہ جاتا ہے۔ جس سے آہنگ اور مفہوم کی اثر آفرینی دو چند ہو جاتی ہے اور قاری اسی آہنگ میں ڈوب جاتا ہے۔ 'بالِ جبریل' کی چھوٹی بحر کی اس غزل کے آہنگ پر نظر رکھیے۔ لفظوں کی معنویت اور آہنگ کے ارتقاء کو ملاحظہ کیجیے۔

ہر شے مسافر ہر چیز راہی — کیا چاند تارے کیا مرغ و ماہی
کچھ قدر تو نے اپنی نہ جانی — یہ بے سوادی یہ کم نگاہی
دنیائے دوں کی کب تک غلامی — یا راہبی کر یا پادشاہی

یہی غزلوں کی عام فضا ہے۔ نظموں میں یہ فضا بدرجہ اولیٰ موجود ہے۔

اقبال کی نظر کلاسیکی ادب کے بیش بہا ذخیرے پر بہت گہری اور نتیجہ خیز ہے۔ انھیں کلاسیکی ادب کے اسالیب و اظہار کا بھرپور عرفان حاصل ہے۔ وہ خواہ عربی ہو یا فارسی۔ ساتھ ہی انگریزی ادب کی آگہی نے اس تجربہ کی دنیا کو اور بھی بے کراں بنا دیا ہے۔ لفظوں کی باہمی ترتیب۔ ترکیبوں کی تخلیق اور استعمال پر انھیں پوری قدرت حاصل ہے۔ ان کے کلام میں قدیم فن کاروں کی فکر، اشعار کی تضمین اور حوالوں کے ذکر سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال کو ان کے اسالیب سے بھرپور واقفیت حاصل ہے۔ اس لیے اقبال کے آہنگ میں کلاسیکی مزاج کی کارفرمائی ناگزیر تھی۔ ان کے آہنگ کا ایک غالب حصہ اسی کلاسیکی آہنگ سے خمیر حاصل کرتا

ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اردو شعراء میں اقبال کا آہنگ سب سے زیادہ کلاسیکی ہے۔ اگرچہ وہ عہدِ جدید کے فن کار ہیں۔ اس عنصر کی شمولیت نے ان کے آہنگ کی اثر آفرینی کو دائمی خلش کی صورت دی اور اسے پائیدار بنا دیا۔ اقبال کا قاری محسوس کرتا ہے کہ ان کا آہنگ مصنوعی نہیں اور عارضی بھی نہیں اور نہ جسم کی بالائی سطح کو چھوڑ کر یا مشتعل کر کے گزر جاتا ہو۔ وہ احساس وادراک کی گہرائیوں میں پیوست ہو کر ایک اضطرابِ پیہم سے دوچار کرتا ہے۔ ایک خلش اور جاں گداز کیفیت دائمی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یہاں شاعر کے خلوص سے انکار ناممکن ہو جاتا ہے اسی کلاسکیت کا نتیجہ ہے کہ اقبال کی اردو شاعری بھی فارسی لفظوں، ترکیبوں، علامتوں سے بوجھل ہے ایک تو وہ دو زبان شاعر ہیں۔ دوسرے کلاسیکی ادب کے رمز شناس ہیں۔ تیسرے ان کے فکر کی بنیادی حیثیت عہدِ رفتہ کے احوال وکوائف کی باز آفرینی ہے۔ ان کا پیغام کھوئے ہوؤں کی جستجو ہے۔ اسلاف کے قلب ونظر کی داستان سرائی کے لیے بھی قدیم کی طرف توجہ ضروری تھی۔ ان وجوہ سے آہنگ کی تشکیل میں فارسی یا قدیم عناصر کی آمیزش ناگزیر تھی یوں بھی فن کی زندگی قدیم وجدید کے ارتباط کے بغیر ممکن نہیں اردو شاعری میں فارسی ترکیبوں، علامتوں سے قطع نظر پورے پورے مصرعوں کی موجودگی سے فارسی اظہار آہنگ کی، غنائیت کو بڑھا دیتا ہے۔ ع

حق را بہ سجودے صنماں را بطوافے

اردو کے مقابلے میں فارسی کا آہنگ کہیں زیادہ متنوع اور غنا سے پر ہے۔ اقبال کی اردو نظموں میں کہیں ابتداء، کہیں درمیان اور کہیں آخر میں، فارسی شعر کے استعمال سے نظم کی موسیقیت میں مزید اضافہ کیا گیا ہے۔ ان کی طویل نظموں کے آہنگ میں یہ اسالیب کارفرما ہیں شمع وشاعر، مسجد قرطبہ، ذوق وشوق میں اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو شاعری کے مقابلے میں اقبال کی فارسی شاعری زیادہ آہنگ ونغمہ رکھتی ہے ان کا فکری ارتفاع بھی فارسی میں ملتا ہے۔ یہی صورت غالب کی فارسی شاعری کی بھی ہے۔ اقبال کے شعری آہنگ کی بھرپور غنائیت فارسی شاعری میں جس اہتمام سے ملتی ہے اردو میں مشکل سے نظر آتی ہے۔

خورشید بہ دامانم، انجم بہ گریبانم　　　در من نگری ہیچم، در خودنگری جانم
در شہروبیابانم، درکاخ وشبستانم　　　من دردم و درمانم، من عیش فراوانم
من تیغِ جہاں سوزم، من چشمۂ حیوانم

یہ 'پیامِ مشرق' کی نظموں یا 'زبورِ عجم' کی غزلوں پر ہی موقوف نہیں ہے۔ یہی غنائیت اردو شاعری کے آہنگ کو بھی زیادہ سے زیادہ مترنم بنا دیتی ہے۔

جادواں، پیہم دواں، ہردم جواں ہے زندگی
نہ مے، نہ شعر، نہ ساقی، نہ شورِ چنگ ورباب
سکوتِ کوہ ولبِ جوئے ولالۂ خودرو
وہ دانائے سبل ختم الرسلؐ مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا

نظموں میں بھی اس اسلوبِ بیان کی بڑی دل نشین صورتیں ملتی ہیں۔ جیسے نظم ''دعا'' کا یہ شعر

صحبتِ اہلِ صفا، نور وحضور وسرور
سرخوش وپُر سوز ہے لالہ لبِ آب جو

یا ''مسجدِ قرطبہ'' میں سلسلہ روز وشب نقش گر حادثات کے تکرار نے صوتی آہنگ کے بہاؤ کو بے اماں بنا دیا ہے اور پھر جہانِ معنی کا ناپیدا کنار عقل ودل نگاہ کو محویت کی طرف مائل کرتا ہے۔

غالب وکار آفریں کارکشا کارساز
خوش دل وگرم اختلاط سادہ وروشن جبیں

'ذوق وشوق' کے مصرعوں کو ملاحظہ فرمائیں

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب
عقل غیاب وجستجو، عشق حضور واضطراب

اقبال کے انفرادی اور تاب ناک آہنگ کی تربیت میں مذہبی اظہار کو بڑا دخل ہے

کلاسیکی آہنگ کا یہ دوسرا پہلو ہے۔ اقبال عقیدے کی بنا پر ہی نہیں بلکہ فلسفیانہ ادراک کی وجہ سے مذہب کے تقدس کے قائل ہیں۔ وہ صحف سماوی کی آخری برگزیدہ کتاب کی آیات وارشادات سے اچھی طرح باخبر ہیں اور عربی واسلامی ادبیات کے ذخیرے سے بھی واقف ہیں۔ ان کی فکری اور شعری تخلیق میں ان سرچشموں کا غالب اثر باقی ہے۔ اور ان ماخذ کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان میں آیات واحادیث کے علاوہ اسما اماکن، تلمیحات وواقعات بھی شامل ہیں۔ اقبال کو قرآن سے بہت زیادہ انہماک رہا ہے۔ آیات کا جس کثرت اور اہتمام سے استعمال کیا ہے۔ مشرقی ادبیات میں مولانا رومی کے بعد اقبال کے علاوہ کوئی دوسرا فن کار نظر نہیں آتا۔ ان کے شعری آہنگ کی فضا میں حجازی لے کا نمایاں ہونا اسی شغف کا نتیجہ ہے۔ یہ لے زیر و بم یا مدھم سروں کے ساتھ بھاری بھرکم آوازوں سے مرکب ہے۔ کیفیت کے اعتبار سے یہ لے جمیل اور دل کش ہے مگر جلال کی پروقار لہریں غالب ہیں۔ ان میں شان وشکوہ کی سربلندی ہے۔ جو عزم وحوصلہ بخشتی ہے۔ وہ فعال اور متحرک کرتی ہے یہ لے ترانے یا حدی خوانی سے زیادہ قریب ہے۔ عربی فقروں، جملوں اور آیات کے استعمال سے حجازی لے بہت نمایاں ہوجاتی ہے۔ یہ اجنبی یا اشعار میں نامانوس بن کر آہنگ کے بہاؤ میں رکاوٹ نہیں پیدا کرتے بلکہ یہ بھی سیال بن کر آگے بڑھتے ہیں۔ ان کی نرمی ولطافت، مترنم ومدھم آوازوں میں گھل مل کر پرکیف بنا دیتی ہیں۔ اگر اس ترکیب، فضا اور تاثیر کو بغور دیکھیں تو محسوس ہوگا کہ ان کا آہنگ کلاسیکی ساز وآواز سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے، اسے دف، چنگ، رباب، بربط وغیرہ موسیقی کے ساز پر زیادہ موثر طور پر پیش کیا جاسکتا ہے یہاں بھی ان کا آہنگ ان کی فکری اساس اور اس کی فضا سے مستحکم ہے۔ ضرب کلیم کی نظم لا الہ الا اللہ کو سامنے رکھئے تو آہنگ کے مذہبی اظہار، کلاسکیت اور حجازی لے کا اندازہ ہوگا۔

تجھ سے مرے سینے میں آتشِ اللہ ھو
سایۂ شمشیر میں اس کی پنہ لا الہ اللہ
وہی فرقاں، وہی قراں، وہی یٰس وہی طٰہٰ
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

آہنگِ اقبال کی ایک نمایاں پہچان اس کا جوش وخروش ہے۔ یہ بھی ان کے فکری تصورات سے ہم آمیز ہے۔ ان کے فکر کی بنیاد حرکت وتوانائی، انقلاب وثبات پر قائم ہے۔ ان کا فلسفہ خود داری وخود بینی کے ساتھ جہانِ تازہ کی تخلیق کا عزم پیدا کرتا ہے۔ یہ شعور دل ونظر میں سما کر انسانی وجود کو تلاطم خیز بنا دیتا ہے۔ اس فکری نظام کی ابلاغ میں پر جوش آہنگ کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے۔ پیغام اور ابلاغ کے باہمی رشتوں سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ نکتہ بھی سامنے رہے کہ آہنگ کی تشکیل کا مدار حرف وصوت پر نہیں ہوتا اس کا گہرا تعلق باطن کے خروشِ احساس سے ہے یہی خروشِ احساس ہے جس کی بدولت عظیم فن کاروں کی تخلیق اور نمود ممکن ہوسکی ہے۔ اس کا مکمل اظہار فن کار کے خلوص اور خونِ جگر کے بغیر ممکن نہیں ہر بڑا فن کار خونِ دل کو فن میں تحلیل کرتا ہے۔ اس کے خلوص کی صداقت اور قدروں پر محکم یقین سے فن جاوداں بنتا ہے۔ انھیں کی مدد سے بلند آہنگ کی تشکیل ہوتی ہے۔ خروشِ احساس، خلوص، خونِ جگر، صداقت اور اقدار کے بغیر فن بے معنی یا شعبدہ گری کا مظہر تو ہوسکتا ہے۔ مگر ادبی فن پارہ نہیں بن سکتا۔ بڑے بڑے قلم کاروں کی سیاسی اور وقتی تخلیقات بھی ہمارے سامنے ہیں۔ جواب ادبی قدر و قیمت سے محروم تسلیم کی جاتی ہیں۔ اقبال کے خلوص یا فکر میں موجود ہجومِ افکار سے انکار ممکن نہیں جب ہجومِ افکار پیرایۂ اظہار اختیار کرتا ہے تو پہاڑوں سے گزرنے والی جوئے آب کی طرح آزاد ہوتا ہے دشت ودمن اور سنگ وریگ سبھی اس کی زد میں بے اماں نظر آتے ہیں یہاں اقبال کا آہنگ بھی پر جوش و پر خروش دکھائی دیتا ہے۔ یہی اثباتِ فکر اور انقلابی پیغام کے لیے موزوں ترین آہنگ ہوسکتا تھا۔ تاکہ جذبہ واحساس کو بیدار و برانگیختہ کر کے صحیح سمت میں اپنے ساتھ لے چلے۔ آہنگ کا یہ بہاؤ بتدریج بڑھتا ہے۔ فکر ونظر کی مخصوص فضا سے اس کا آغاز ہوتا ہے۔ ابتدا میں یہ ذہن کو متوجہ کرتا ہے۔ خضر راہ مسجد قرطبہ، ذوق وشوق، ساقی نامہ کے ابتدائیہ کو بغور دیکھیں تو محسوس ہوگا کہ نفسِ موضوع یا پیغام کے سیاق وسباق سے متعلق تہذیبی یا خارجی پس منظر سے ابھرتا ہے اور آہنگ اسی فضا سے آہستہ آہستہ نمودار ہوتا ہے۔ 'ذوق وشوق' جیسے غیر مرئی موضوع کو تہذیبی علامتوں میں ڈھال کر اسے پیکرِ احساس دیا گیا ہے۔ یہ وہی ثقافتی فضا ہے جو 'مسجدِ قرطبہ'، طارق عبدالرحمٰن اول اور ہسپانیہ کی علامتوں سے تخلیق پاتا ہے۔ ساقی نامہ کے ابتدائی اشعار میں دوسری تصویر اور دوسرے

کوائف ایک نئی فضا پیش کرتے ہیں۔ آہنگ اس پس منظر کے اندروں سے ابھرتا ہے، جوئے کہستان کے ساتھ ساتھ آہنگ کا سیل بھی تیز و تند ہو جاتا ہے۔ پوری نظم میں آہنگ کا عروج آگے کی طرف گامزن ہے اور یہ سفر فروغِ تجلی پر تمام ہوتا ہے۔ آہنگ کی رواں دواں کیفیات کا ایسا مظاہرہ تخلیق میں معجز نمائی کی مثالی حیثیت رکھتا ہے۔

اقبال نے آہنگ سے ایک اور کام لیا ہے۔ ان کی طویل اور مشہور نظموں کے مختلف بندوں کو لیجیے۔ ہر بند میں ایک نیا موضوع ہے۔ مثلاً مسجد قرطبہ کو لیجئے۔ پہلا بند زماں و مکاں سے متعلق ہے۔ دوسرا عشق کی ابدیت پر مشتمل ہے۔ تیسرا فن کے دوام کا ذکر کرتا ہے، چوتھا اور پانچواں مرد کامل پر محیط ہے۔ اس طرح سے دوسرے بند بھی ہیں۔ اگر انھیں علیحدہ کر دیں تو بآسانی بالِ جبریل کی غزلوں میں شامل ہو جائیں گے اور اگر ان کا عنوان قائم کر دیں تو کئی نظمیں وجود میں آئیں گی لیکن طویل نظموں کی تخلیق میں ان مختلف حصوں کو فکر کی باطنی تنظیم اور آہنگ کی اندرونی کیفیت سے مربوط کیا گیا ہے۔ آہنگ کا یہ تسلسل ان طویل نظموں کو زیادہ بامعنی اور مؤثر بناتا ہے کائنات کی ہر شئے فانی ہے۔ یہ پہلے بند کا اختتامیہ ہے، اب دوسرے بند کا آغاز دیکھیے:

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام

پھر دوسرے بند کا اتمام اور تیسرے بند کا آغاز اسی باطنی تنظیم سے مربوط ہوتے ہیں۔ آہنگ کا خروش اور تسلسل لفظوں کے تلازمے، ترتیب اور معنی آفرینی سے متحرک تصویریں نمایاں کرتا ہے۔ ساقی نامہ کے پہلے بند کو لیجئے۔ شہید ازل لالہ خونی کفن، اور لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں، کا پیغام یا کائناتی بصیرت نیلی نیلی فضاؤں سے جوئے آب کی صورت آشکار ہوتا ہے۔ یہاں آہنگ کو رجز و رزمیہ کی حد تک لے جایا گیا ہے۔ یہ اشتعال عارضی نہیں بلکہ سوز و گداز کی دوامی کیفیت دلوں کو عزیمت عطا کرتی ہے۔ اس گداز کی وجہ سے آہنگ انتہائی مؤثر محسوس ہوتا ہے فکرِ اقبال کے مخالف بھی آہنگ کی اثر آفرینی سے محفوظ نہیں رہ پاتے۔ اقبال کے نزدیک خاراشگافی اور خارگدازی پسندیدہ عمل ہے۔ آہنگ کی اس

گدازی سے ثقیل وسنگ لاخ الفاظ کی کرختگی اور ناہمواری یا کم مانوس الفاظ کی اجنبیت باقی نہیں رہتی۔ بلکہ ان سے نغمہ وآہنگ کی ریزش شروع ہوئی ہے۔ وہ نغمہ جو انفی آوازوں یا نرم ونازک اصوات سے نہیں پیدا کیا جاتا۔ بلکہ غیر انفی اور غیر مترنم اصوات کے مجموعی تاثر سے وجود میں آتا ہے۔ عتیق، زندیق، دقیق، سماوات، فلزات، مفاجات، رحیل، اصیل، جبریل، فساد، کشاد، بنیاد، ادراک، خاشاک، عرقناک، اللہ ہو، کدو، جستجو، کشود، کبود، ورود کے قافیوں کو ملاحظہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ الفاظ کس طرح پگھل کر ترنم پیدا کرتے ہیں۔ نغمہ وآہنگ کا بہت کچھ مدار اسلوب، ہیئت یا خارجی سانچے پر ہوتا ہے اردو شاعری میں ردیف وقافیہ کی پابندی وزن وبحر کی رعایت نے نغمہ آفرینی میں اضافہ کیا ہے۔ غزل گو شعرا نے مترنم بحروں کے انتخاب اور خوش آہنگ قافیوں کا بڑا التزام رکھا ہے غزل کی ہر دل عزیزی میں نغمگی کو کافی دخل ہے۔ ان سب کے باوجود یہ حقیقت مسلم ہے کہ نفسِ موضوع ظاہری ہیئت کے تابع نہیں۔ لیکن بڑے فن کار کے لیے۔ عظیم فن کار ہیئت کی دنیا میں بھی اپنے اکتسابات سے بڑی تبدیلیاں لاتا ہے۔ وہ روایتی پابندیوں سے انحراف بھی کرتا ہے موضوع اور ہیئت دونوں اعتبار سے اقبال کی دنیائے غزل روایات سے یکسر بدلی ہوئی ہے۔ انھوں نے مینائے غزل کو نئے ممکنات اور نئی جہت سے روشناس کیا۔ مطلع ومقطع، ردیف وقافیہ کے مروجہ اصولوں کو بھی نظر انداز کیا۔ بال جبریل کی پانچویں غزل ردیف وقافیہ کے اعتبار سے مختلف ہے۔ مستعار کا، انتظار کا، کے ساتھ لازوال ہو کا قافیہ ان کے اسی اجتہادی نقطۂ نظر کی غمازی کر رہا ہے۔ اس اختلاف کے باوجود غزل کا آہنگ مجروح نہیں ہوتا۔ ''فقر ہے میروں کا میر فقر ہے شاہوں کا شاہ'' کے آہنگ میں اشہد ان الا اللہ کی آواز مدغم ہو جاتی ہے۔ یہ تجربات آسان اور عام تخلیق کار کے لیے نہیں۔ اقبال کی شاعری کے آہنگ کا دائرہ بہت زیادہ وسیع اور تہ در تہ ہے۔ اور اس حد تک ترنم خیز ہے کہ اسے ساز کے ہر تار پر گایا جا سکتا ہے اور خاطر خواہ مؤثر کیفیت پیدا کی جا سکتی ہے۔ اقبال نے اثر آفرینی کے لیے کسی خاص مخصوص بحر یا اوزان کا انتخاب نہیں کیا بلکہ ان کی شاعری کے مختلف بحروں میں یہ نغمگی عام ہے۔ خواہ یہ طویل بحریں ہوں یا مختصر۔ ان کی طویل بحروں کی دونوں غزلیں بہت مشہور ہیں۔

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں

یا

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا

لیکن مختصر ترین بحروں میں بھی موسیقت کیف و کم کے اعتبار سے کم تر نہیں۔

نے مہرہ باقی نے مہرہ بازی

جیتا ہے رومی ہارا ہے رازی

اقبال نے آہنگ تراشی کے لیے کم مترنم یا غیر انفی آوازوں کے ساتھ خوش آہنگ قافیوں کے استعمال سے آہنگ کی جھنکار میں دل کشی پیدا کی ہے۔ جیسے جنوں، زبوں، گردوں، گوناگوں، کن فیکون، زیاں، طیلساں، پرنیاں، کارواں وغیرہ۔ یا شعر و نغمہ کی لطافتوں سے لبریز نظم شاہین کو لیجیے جس میں آہنگ اور موسیقی ایک سحر آفریں تخلیق کی صورت میں نمودار ہوتی ہے ہر مصرع اور ہر شعر مترنم آوازوں پر مشتمل ہے۔ یہاں نغمگی کا انحصار صرف قافیوں اور لفظوں کے حسنِ انتخاب پر نہیں ہے بلکہ فکر و پیغام تخلیقی تجربے کا طاقت ور محرک بن گئے ہیں۔ تخلیقی تجربہ کی یہ نوعیت فن کے اسلوب و ہیئت یا نغمہ و آہنگ کی مرہونِ منت نہیں ہوتی بلکہ وہ تخلیقی فعالیت کی گرفت و گیر میں ہوتی ہے۔ اور اسی فعالیت کی شدت یا گہرائی پر شعر و فن کا منہاج مقرر ہوتا ہے۔ فن کے اعلی معیار و منہاج پر شعر و پیغام کی مغائرت یا فرق ختم ہو جاتا ہے اقبال کے کلام کا بڑا حصہ شعر و پیغام کے اسی میزان پر قائم ہے، جہاں قاری متحیر ہو کر شعر و پیغام کی ابتدا اور انتہا کا سراغ نہیں لگا پاتا اقبال کے نزدیک شاعری صرف کلامِ موزوں کا نام نہیں اور نہ ذریعۂ انبساط فن یہ پیغام کی ترجمانی کا ایک موثر وسیلہ ہے۔ یہ حقائق زندگی کا شعور پیدا کرنے کے لیے انسانی تخلیق کا بے مثل ذریعۂ اظہار ہے۔ شاعری آوازوں کی موزونیت کے ساتھ موسیقی و نغمگی سے پیدا ہونے والی مترنم کیفیت کا نام ہے خواب آوری کی کیفیت نہیں بلکہ وہ کوائف جو جذبہ و احساس میں ہنگامہ اور ہلچل پیدا کر سکیں۔ اقبال کو وہی پر شور اور پر سوز آہنگ پسند ہے جو جذبہ و ادراک کو بیدار کرے اور توانا رکھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے شاعری کے جملہ اصناف یا خارجی ہیئت کو

برتنے کے باوجود آہنگ کے رجز کو باقی رکھا۔ غزلوں اور نظموں کی عام مروجہ ہیئت سے قطع نظر دوسری صورتیں اسی نکتہ کو پیش کرتی ہیں۔

رومی بدلے شامی بدلے بدلا ہندوستان
تو بھی اے فرزندِ کہستاں اپنی خودی پہچان
اپنی خودی پہچان
او غافل افغان

یا

پانی ترے چشموں کا تڑپتا ہوا سیماب
مرغانِ سحر تیری فضاؤں میں ہیں بے تاب
اے وادیٔ لولاب

نغمۂ سارِبانِ حجاز، کے ہر بند میں مستعمل اس مصرع!

تیز ترک گامزن منزلِ مادورنیست

پر نظر رکھئے تو دوسرا آہنگ اور ایک مختلف کیفیت نظر آئے گی۔ اس مصرع کی تکرار اور اس کی غنائیت دوسرے بندوں کو جوڑتی اور آہنگ کے بہاؤ کو آگے بڑھاتی ہے۔ آہنگ کا ایک اور روپ ''زبورِ عجم'' میں ملتا ہے۔ ابتدائی تینوں مصرعوں کا آہنگ ایک ہے۔ بعد کے چوتھے مصرع اور ٹیپ کے مصرعے ہم آواز ہو کر ترنم کی نئی صورت پیدا کرتے ہیں۔

فریاد زافرنگ ودلآویزیٔ افرنگ — فریاد زشیرینی وپرویزیٔ افرنگ
عالم ہمہ ویرانہ زچنگیزیٔ افرنگ — معمارِ حرم باز بہ تعمیرِ جہاں خیز
از خوابِ گراں خوابِ گراں خوابِ گراں خیز
از خوابِ گراں خیز

رزمیہ آہنگ کی دوسری کیفیت ''زبورِ عجم'' میں ملاحظہ ہو۔

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب
از جفائے دہ خدایاں کشت دہقاناں خراب

انقلاب

انقلاب اے انقلاب!

اس کی تیسری صورت ''پیامِ مشرق'' کی نظم ''شبنم'' میں ملتی ہے۔

رجز خوانی کے اس دھن میں صوتی تکرار کی جھنکار سے جذبہ واحساس فوج وسپاہ کے ساتھ پس منظر کی فضا بھی جاگ اٹھتی ہے۔ ان کے آہنگ کی یہ انوکھی کیفیت ہے۔ آہنگ کی یہ عجیب وغریب کیفیت جسم وجاں کے رگ وپے میں پیوست ہو جاتی ہے۔ اقبال کا یہ اختراعی آہنگ منظر ومحاکات کی خارجی شکلوں میں نغمہ سرائی کی کیفیات سے معمور نظر آتا ہے۔ ''پیام مشرق'' کی کئی نظموں میں آہنگ کی یہ نادر صورت موجود ہے۔ ساقی نامہ، فصلِ بہار، جوئے آب وغیرہ۔ مؤخر الذکر نظم کی ہیئت مختلف ہے۔ اور اس کا آہنگ بھی مختلف ہے۔

در راہِ او بہار پریخانہ آفرید　　　نرگس دمید ولالہ دمید وسمن دمید
گل عشوہ داد وگفت یکے پیش ما بایست　　　خندید غنچہ وسر دامانِ او کشید
نا آشنائے جلوہ فروشانِ سبزہ پوش　　　صحرا برید وسینۂ کوہ وکمر درید

زی بحر بیکرانہ چہ مستانہ می رود
درخود یگانہ از ہمہ مستانہ می رود

اس نظم میں چھ مصرعوں کے بعد ساتواں اور آٹھواں مصرع صوتی تکرار پیدا کرتا ہے۔
خارجی مناظر کے تعلق سے آہنگ کی دوسری کیفیت اس طرح کے کلام میں ملتی ہے۔

رخت بہ کاشمر کشا کوہ وتل ودمن نگر
سبزہ جہاں جہاں ببیں لالہ چمن چمن نگر

شعر ونغمہ کی زد میں حواس اور مظاہر سبھی بے اماں نظر آتے ہیں۔ آہنگ کی روح مظاہر کائنات میں زندگی پیدا کرتی ہے۔ اس پس منظر میں الفاظ آہنگ کی بدولت تحلیل ہو جاتے ہیں۔ اقبال کی شاعری میں الفاظ کی پگھلتی اور تحلیل ہوتی تصویریں آہنگ کو سیلِ رواں میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ اقبال کے ہاں یہ بہاؤ فکر کے تلاطم سے متحرک ہوتا ہے۔ بیرونی فضا میں نغمہ کی یہ رواں دواں کیفیت سماعت سے گزر کر نظر کے سامنے موجود ہوتی

ہے۔ایک اچھوتی مثال ملاحظہ ہو۔

رنگ ہا، بوہا، ہوا ہا، آب ہا　　　آب ہا، تا بندہ چوں سیماب ہا
لالہ ہا درخلوتِ کہسار ہا　　　نار ہا یخ بستہ اندر نار ہا

ہا کے اضافہ سے صرف مناظر فطرت کی بوقلمونی وفراوانی ظاہر نہیں ہوتی۔آہنگ کی ارزانی بھی پورے پس منظر میں پھیل کر سوزِ کائنات بن جاتی ہے۔

اقبال کو آہنگ کا احساس یا شعور وجدانی طور پر حاصل ہے۔جذب وشوق یا سوز گداز کی کیفیات کے ساتھ آہنگ کی سبک اور خاموش سرمستی بھی انتہائی خیال افروز اور جاں گداز ہوتی ہے آہنگ کی غنائیت پر وہ حسب ضرورت متوجہ نہیں ہیں۔ کیونکہ ان کے مقاصد دوسرے ہیں اس کے باوجود کلام میں آہنگ کی ہمہ گیر صورتیں موجود ہیں۔اصناف ادب کا ہر پہلو انفرادی تجربات کے ساتھ موجود ہے۔ پیغام وفکر کی رعایت سے ہیئت کے انتخاب نے آہنگ کو زیادہ پُر اثر بنادیا ہے۔مسدس، مخمس، مثنوی، مستزاد، قطعات، غزل، نظم وغیرہ مختلف اسالیب نے آہنگ شعر کو ایک جہانِ ممکنات سے روشناس کیا ہے۔جس سے آہنگ کا کینوس وسعت طلب ہوگیا ہے۔

اقبال کا آہنگ سیال صفت ہے۔اس کی جولانی میں فلسفہ کے نکات اور الفاظ بھی سیال ہوجاتے ہیں۔اس سبب آہنگ کے سیال کی افزونی میں توسیع ہوتی ہے۔اقبال کے اسالیب کے ساتھ ان کا ذخیرۂ الفاظ بھی بہت ہی ہمہ گیر ہے الفاظ کی تہ در تہ معنویت اسے اور بھی زیادہ وسعت بخشتی ہے۔اس سے آہنگ کی معنوی دنیا اور تاثیر میں اضافہ ہوتا ہے۔ذخیرۂ الفاظ کی کثرت کے باوجود آہنگ کی تشکیل میں اقبال نے کثرت اصوات سے گریز کیا ہے۔مصرعوں کی ساخت میں صرف چند یا محدود آوازوں سے کام لیتے ہیں جس کی وجہ سے شعری آہنگ آوازوں کی کثرت کے سبب نہ بکھرتا ہے اور پھیل کر بے اثر ہوتا ہے محدود آوازوں پر منحصر آہنگ زیادہ منظم، مؤثر اور مربوط ہوتا ہے۔

شب سکوت، افزا ہوا آسودۂ دریا نرم سیر
تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویرِ آب

مظاہر فطرت کی مصوری اور متحرک آہنگ قابلِ ذکر ہے۔ یہ آہنگ چند آوازوں کے سہارے تیار کیا گیا ہے۔ پورا مصرع اٹھائیس آوازں پر مشتمل ہے۔ اس میں کل بارہ بنیادی آوازیں ہیں عروف علت کو ملا کر پندرہ آوازیں شامل ہیں۔ دوسرے مصرع میں انتیس آوازیں ہیں مگر آہنگ آفرینی کے لیے کل بارہ حرفوں سے مدد لی گئی ہے۔ پورے شعر میں ستاون حروف ہیں مگر آہنگ کے لیے کل چودہ آوازیں مستعمل ہیں۔ کلامِ اقبال میں آہنگ آفرینی کی یہ صورت بہت نمایاں ہے جس کی وجہ سے آہنگ کی تنظیم اور تاثیر بے پایاں ہے۔

اقبال کے کلام میں اکثر مصرعوں، فقروں، ترکیبوں کا تکرار بھی ملتا ہے۔ اس تکرار سے آہنگ کا صوتی حسن بڑھ جاتا ہے۔ اور خوش آہنگ لب ولہجہ تکنک اور ترتیب دونوں کی حسن آفرینی میں بڑا امدگار رہوتا ہے۔ موسیقی کے پیہم ارتعاشات سے ذہنوں میں چمک پیدا ہوتی ہے۔ ''مسجدِ قرطبہ'' کا سلسلۂ روز وشب اور ''مسولینی'' میں ندرتِ فکر وعمل کے تکرار سے اسے ذہن نشین کیا جا سکتا ہے یہ آہنگ بتدریج بڑھتا ہے۔ قاری کو اس منزل پر چھوڑتا ہے۔ جہاں جذبات اشتعال سے گزر کر جنوں خیز ہو جاتے ہیں۔ جیسے خضر راہ کا پہلا بند آگ ہے اولادِ ابراہیم ہے نمرود ہے یا دوسری نظمیں۔

کلامِ اقبال کی طرح ان کے آہنگ کی ایک انفرادیت اس کا تمثیلی یا ڈرامائی اسلوب واظہار ہے مکالماتی پیرایۂ بیان میں غنائیت کی ارتقاعی صورت اکثر دیکھنے میں آتی ہے۔ دو مختلف متضاد پیکروں کے درمیان آہنگ کا اظہار بھی مختلف اور دوسرے سے نمایاں ہوتا ہے کرداروں کے اعمال وافکار کا اختلاف آہنگ سے نمایاں ہونا فن کا حیرت انگیز کارنامہ ہے۔ اقبال کی مکالماتی نظمیں پیشِ نظر ہوں تو یہ نکتہ زیادہ آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ جبریل وابلیس، پیر رومی ومرید ہندی وابلیس کی مجلس شوریٰ، محاورہ مابین خداد وانسان وغیرہ۔ ان میں ''جبریل وابلیس'' جیسی نظم کا وجود فنّی تاریخ میں ابھی تک نئی تخلیق کی منتظر ہے۔ ماقبل تاریخ میں بھی مفقود نظر آتی ہے۔ شاید ہی کسی نظم کا ایک مصرع اس طرح مقبول ہوا ہو کہ وہ طرزِ بیاں بن گیا ہو:

'سوز وساز ودرد وداغ وجستجوے وآرزو'

اقبال نے صرف اسالیب یا اظہار کی بدولت شاعری کو نئے ممکنات سے متعارف ہی نہیں کیا۔ بلکہ ان کے اکتسابات اور عظیم تخلیقی سرچشمہ نے نغمہ و آہنگ کی بے کراں دنیا کو شاعری میں سمو دیا۔ اگر چہ وہ نہ مغنی تھے نہ موسیقار۔ مگر تخلیقِ فن کی اس سربلندی پر فائز تھے۔ جہاں صرف فنونِ لطیفہ کے ہی نہیں بلکہ علم وادراک کے تمام شعبے نقطۂ وجدان پر مدغم ہو جاتے ہیں۔ اقبال نے اسے نقطۂ نور سے تعبیر کیا ہے جس سے سرچشمۂ زندگی کی شادابی ہوتی ہے۔ خودی اسی نقطۂ نور کی مظہر ہے۔ یہ نقطۂ نور اپنی حیثیت میں قائم بالذات نہیں بلکہ عرض ہے جس کا بنیادی جوہر نورِ الٰہی ہے۔

خودی روشن زنورِ کبریائی است

سرسید مصدرِ اقبال

اسے فکر ونظر کا استعجاب کہیے یا دنیاے ادب کی حیرت فزائی کہ ایک عظیم فنکار استفادے اور استخراج کے اتنے گوناگوں مصادر کا حامل ہو جس کی نظیر علم ودانش میں موجود نہیں ہے۔ بالفاظ دیگر متعدد قابلِ ذکر فلاسفہ، فنکار، صحائف، انبیاء کے اقوال وآثار اور مختلف النوع فرمودات کا ایسا دل نشیں مرکب اقبال کے علاوہ کہیں نظر نہیں آتا۔ یہاں اخذ واستنباط کی نوعیت پر گفتگو مقصودِ خاطر نہیں ہے، یہ صرف ایک سرچشمۂ دانش کے موثرات کی طرف اشارہ ہے، میں اقبال کو سرسید کے مشن کی تجدید اور توسیع سمجھتا ہوں، علمی وفکری سطح پر اس مشن اور منصوبے کی اضافی صورت کا نام ہی اقبال ہے، سرسید کے علم وعمل نے افکار کی آویزش کا جو سیل پیدا کیا تھا اسے مربوط اور منظّم فکر کی صورت اقبال نے دی، فکری عناصر ہوں یا اس کے اجزاء وابعاد کہیں نہ کہیں ان کا سررشتۂ فیض سرسید سے ملے گا، راقم نے بہت پہلے ۱۹۶۹ء میں اپنی پہلی کاوش میں یہ اعتراف کیا تھا، بعد ازاں ڈاکٹر جاوید اقبال کی تحریر نے مجھے مزید تقویت بخشی کہ اقبال کو اس پس منظر میں بھی دیکھنے کی ضرورت ہے، یہ صرف اقبال پر ہی موقوف نہیں بلکہ مرشدِ معنی کے افکار برصغیر کے مسلم دانشوروں کا ہمیشہ تعاقب کرتے رہیں گے۔

مرشدِ معنی نگاہاں بودۂ واقفِ اسرارِ شاہاں بودۂ

یہ مسلم ثقافت کی معجز نمائی ہے کہ انحطاط کے فتنہ وفسوں میں بھی حیات بخشی کے امکانات روشن ہوتے رہے اور معاشرے کو مہمیز کرتے رہے، فکری تبحر و تجدید نے نئے عنوان سے تیرہ وتاریک فضا کو مستنیر کیا ہے، اس سوادِ عظیم کے علم وعمل کی اساس اور ارتفاعیت میں عبقری فکر تسلسل کے ساتھ کارفرما رہی ہے، شیخ مجدد سرہندی سے شاہ ولی اللہ دہلوی، سرسید احمد خاں اور شیخ محمد اقبال کے نفوذ سے ہی یہ معاشرہ تاب کار ہے، اس سیلِ فکر میں دوسرے ضمنی اور اضافی تصورات بھی معاون رہے ہیں، مگر ہماری شناخت اس فکری تسلسل کے اقرار واعتراف کے سبب ہے۔ شرح وبیان کی تفصیلات سے قطعِ نظر عرض ہے کہ ولی اللٰہی تحریک سے سرسید کا براہ راست تعلق ہے اور مؤخر الذکر نے اقبال کے قلب ونظر کو کشادگی اور فراخی بخشی ہے۔ میں پیشین گوئیوں کا نہ معتقد ہوں اور نہ ہی مرعوب جیسے پیکرِ اقبال میں روحِ غالب کا حلول کرنا یا اگر سرسید نہ ہوتے تو فارسی زبان میں خودی کا فلسفہ نازل نہ ہوتا یا اگر حالی نہ ہوتے تو اقبال کی شاعری نہ ہوتی جیسے اقوال بے معنی ہیں، ہر مفکر اور مجتہد نہاں خانۂ ازل سے اپنی متاعِ فکر لے کر آتا ہے، وہ اسلاف کی فکری یافت سے بے نیاز نہیں رہ سکتا، انسانی فلسفہ وادراک ایک تفکیری تسلسل کا نام ہے جو ردو قبول کے باوجود رواں رہتا ہے۔ وحدتِ فکر میں ارتباط وانضمام کے عمل کی کارفرمائی بھی نمایاں رہتی ہے۔

ولی اللٰہی تحریک کے زیرِ سایہ سرسید کی نشو ونما ہوئی ان کی تربیت میں یہ تحریک ایک مرکزی مقام رکھتی ہے، اس خانوادے کے فرزندانِ ارجمند شاہ عبدالعزیز اور شاہ اسمٰعیل شہید سے ذہنی وفکری قربت کے احوال محفوظ ہیں، مولانا حالی سے لے کر بشیر احمد ڈار تک سنجیدہ مصنفین کی کاوشیں ہماری راہنما ہیں، یہی تعلق ہے جو سرسید کے شب وروز کی بصیرتوں میں ڈھل کر شعبہ ہائے حیات پر محیط ہو جاتا ہے، ان کی نظر صرف معاشرت کی اصلاح پر ہی مرتکز نہیں ہے وہ آگے بڑھ کر اجتہاد کی سرحدوں کو بھی عبور کرتی ہے اور احتجاجی لہجے کی بدولت خروشِ احساس میں ہلچل پیدا کرتی ہے، اس منزل سے آگے ندرتِ فکر وعمل کے انقلاب کی داعی بن جاتی ہے اور فرد کے وجود سے معاشرے کے ممکنہ حدود پر کمندیں ڈالتی ہے، ان انقلاب آفریں تصورات کو محض اصلاحی تحریک کا نام دے کر مطمئن ہو جانا دراصل

اس خام نظر کی بدتوفیقی ہے جو اسی پر مطمئن ہے۔ وہ اس لازوال تحرک اور فعالیت کے جوہر کو دیکھنے سے قاصر ہے جو تقدیر امم بدل دینے کا عزم رکھتی ہے، جدید اسلوبِ فکر کا مطالبہ ہے کہ ہم مغلوب ذہن کی درماندگی سے دور ہو کر ان تازہ کار منصوبوں کے سیاق کی مہم جوئی میں مشغول ہوں اور پروقار زندگی جینے کا دستور العمل ترتیب دیں، یہ نہ اسرار بینی ہے اور نہ ہی ادعائیت بلکہ سرسید کی تعلیم اور ان کے تصورات کی باز آفرینی کی عاجزانہ کوشش ہوگی، اسے صرف اصلاح تک محدود نہ کریں۔

کبھی گل کہہ کے پردہ ڈال دیتے ہیں ہم اس رخ پر

اس سعی کے محاصل پر ہی معاشرے کے استحکام اور اقتدار کا انحصار ہوگا۔ سرسید کی اجتہادی فکر ممدوح بھی بنی اور مذموم بھی جس میں عوام وخواص سبھی شامل ہیں، علماء کا ایک گروہ اختلافی آراء واہواء کو شہ دے رہا تھا اور در پے آزار تھا، پنجاب کے اکابر وعلماء بھی تنبیہ وتوبیخ میں آگے ہی تھے، چند ہی عالم ان کے ہم خیال تھے جن میں مولانا سید میر حسن پیش پیش ہی نہیں، سرسید کے بڑے معاون وموید تھے، وہ ہر طرح سے ان کی تحریک کے تحفظ کے لیے تیار رہتے تھے، خود بساط بھر دامے درمے مدد پہنچاتے اور دوسرے حضرات کو بھی متوجہ کرتے، غبن کے خسارے کی تکمیل کے لیے ان کی کوشش کو سرسید نے بہ نظرِ استحسان تسلیم کیا ہے اور سپاس گزاری میں فراخ دلی کے ساتھ ممنونیت کا اقرار کیا ہے، سرسید جب کبھی پنجاب کا دورہ کرتے مولانا استقبال کرتے اور پذیرائی فرماتے، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں کے انعقاد کا اہتمام کرتے اور کھلے لفظوں تحریک کا تعارف کراتے وہ سرسید کی دعوت پر علی گڑھ بھی تشریف لاتے، ۱۸۷۷ء میں وائسرائے نے کالج کا سنگِ بنیاد رکھا مولانا اس تقریب میں شریکِ محفل تھے۔ مولانا سرسید کے علمی کاموں سے بھی کمال شغف رکھتے، تفسیری مباحث میں ان کے استفسارات شاہد ہیں کہ علمی وفکری سطح پر بھی دونوں میں بڑا قرب تھا دونوں کی مراسلت گہرے تعلقات پر مبنی ہے، مکتوباتِ سرسید میں مولانا کے نام دس خطوط ہیں جو علمی اور دوستانہ روابط کے مظہر ہیں، یہ وہی مولانا میر حسن ہیں جو علامی عبدالحکیم سیالکوٹی کی روایت کے امین ہیں اور جو شیخ محمد اقبال کے استادِ کل اور اقبال

گر بھی کہے جاتے ہیں، اقبال کے بیشتر ناقدین نے اقبال کی فکری تشکیل میں اس عنصر کی اہمیت کی وضاحت کی ہے۔ "ذکرِ اقبال" میں عبدالمجید سالک نے مولانا کی شخصیت اور اثرات کے پیشِ نظر علیحدہ ایک باب قائم کیا ہے۔ اور لکھتے ہیں "مولانا میر حسن کے فیضِ تربیت سے اقبال برابر بہرہ مند ہوتے رہے اور فاضل وشفیق استاد نے اس جوہرِ قابل کو علم وحکمت، شعروادب، فارسی وعربی زبان دانی اور فکرِ صحیح کے محاسن سے مالا مال کردیا۔ علامہ اقبال بھی مولانا کے عزت واحترام میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے تھے اور ۱۹۲۹ء تک جب مولانا کا انتقال ہوگیا ہمیشہ جب کبھی سیالکوٹ جاتے اس آستانۂ علم پر جبیں سائی سے ہرگز غفلت نہ کرتے۔"[۱]

خود علامہ کے اقرار کی صداقت کے بعد کسی اور حوالے کی ضرورت نہیں رہتی، یورپ جانے سے قبل کی ۱۹۰۴ء کی نظم "التجائے مسافر" کے اشعار اس نسبت پر قولِ فیصل کا درجہ رکھتے ہیں۔

وہ شمع بارگہِ خاندانِ مرتضویؓ
رہے گا مثلِ حرم جس کا آستاں مجھ کو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی
بنایا جس کی مروّت نے نکتہ داں مجھ کو

دعا یہ کر کہ خداوندِ آسماں وزمین
کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجھ کو

ابتدائی دور کے کلام میں ایک اعلانیہ حرفِ آخر کی سند رکھتا ہے

مجھے اقبال اس سید کے گھر سے فیض پہنچا ہے
پلے جو اس کے دامن میں وہی کچھ بن کے نکلے ہیں

گویا مولانا میر حسن کے توسط سے سر سید تک رسائی کے واضح نشانات موجود ہیں اور

---

[۱] ذکرِ اقبال صفحہ ۲۶

اقبال و سرسید کے درمیان مولانا سید میر حسن ہی نقطۂ اتصال ہیں، یوں بھی اقبال کی چشمِ حقیقت بین نے سرسید کے حین حیات کے ۲۱ سال دیکھے اور پھر سر راس مسعود کے پیکرِ اخلاص میں سرسید کی شفقت اور دل نوازی کی سعادت براہ راست حاصل کی، سر راس مسعود مرحوم نے اقبال کی مشکل دقتوں میں بڑی مدد کی ہے پوری ملت سرسید کے جگر گوشے کی ممنونِ منت ہے بڑے بڑے فرمارواؤں کے کنز و کشکول اقبال کے لیے خالی تھے، حکیم الامت کے علاج و اعانت سے اعراض نا قابلِ معافی ارتکابِ جرم تھا، نتیجتاً ان کی دارائی اور خاقانی سب کا فرادا کے غمزۂ خون ریز کی نذر ہو گئی، صرف سید کے نورِ نظر کا ملت پر احسان با قی رہ گیا، اقبال کو ان پر کیا کیا ناز اور اعتماد تھا ان کے وصیت نامے کی عبارت سے عیاں ہے، ان کی ناگہانی وفات پر اقبال کو جو صدمہ پہنچا اس کا اندازہ اس نظم کے حرف حرف سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔

رہی نہ آہ زمانے کے ہاتھ سے باقی
وہ یادگارِ کمالاتِ احمد و محمود
زوالِ علم و ہنر مرگِ ناگہاں اس کی
وہ کارواں کا متاعِ گراں بہا مسعود
نہ کہہ کہ صبر میں پنہاں ہے چارۂ غمِ دوست
نہ کہہ کہ صبر معمائے موت کی ہے کشود

مرثیۂ غالب سے صرفِ نظر کر لیں تو اقبال نے ہی شخصی مرثیہ نگاری کی ابتداء سرسید سے کی تھی وہ داغ، والدہ مرحومہ سے ہوتی ہوئی فلسفہ و شعر کے ابدی عروج کے ساتھ مسعود مرحوم پر ختم ہو جاتی ہے، گویا ابتداء اور انتہا دونوں میں اقبال کے قلبی واردات اور فکر و نظر کی کیفیات کا دل نشین ارتباط اسی خاندان کے تعلق سے قائم ہے، ۱۹۰۳ء میں لکھی گئی نظم ''سید کی لوح تربیت'' کا تجزیہ بڑی تفصیل چاہتا ہے، وہ الگ عنوان کا متقاضی ہے، اجمالاً یہ کہا جا سکتا یہ کہ اقبال کے پر شکوہ شعر و پیغام کے آغاز کی حامل یہی نظم ہے، شاعری پیغمبری کی ہم دوش ہو کر آواز دیتی ہے۔

پاک رکھ اپنی زباں تلمیذِ رحمانی ہے تو
ہو نہ جائے دیکھنا تیری صدا بے آبرو
سونے والوں کو جگادے شعر کے اعجاز سے
خرمنِ باطل جلادے شعلۂ آواز سے

لوحِ تربت کی تحریر میں بہت سے اسرار کندہ ہیں، مگر ایک نکتہ کے حروف قدرے جلی ہیں، وہ سرسید کو عزیز اور اقبال کو عزیز تر اور ہمارے لیے سامانِ زیست ہیں۔

مدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیم دین   ترکِ دنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں

سرسید کی اس تعلیمی وابستگی اور سعی پر ان کے مشن کا بہت کچھ مدار ہے، اسے فلسفہ اور شعر کے آہنگ میں ڈھالنے کا کام اقبال نے انجام دیا۔ ۲۷ رمارچ کو مردِ خود آگاہ کی وفات کی خبر ملی۔ مولانا میر حسن اور اقبال نے مادۂ تاریخ برآمد کیا، اول الذکر نے غفرلہ اور علامہ نے قرآن کریم کی آیتِ پاک سے استخراج کیا، حیاتِ جاوید میں مولانا حالی نے توثیق کی ہے اور بدون حوالہ یہ اندراج موجود ہے ''اگرچہ سرسید کی وفات کی بہت سی تاریخیں لکھی گئی ہیں لیکن دو عربی مادے عجیب وغریب نکلے ہیں، ایک غفرلہ اور دوسری قرآن مجید کی یہ آیت ''انی متوفیک ورافعک الی ومطھرک''[1]

دیگر مباحث سے قطعِ نظر سرسید تحریک کے اسی اکتساب کا ذکر اقبال کے حوالے سے کرنا چاہوں گا۔ اقبال نے اپنے اکتسابات کی نوعیت کے ساتھ ماخذ ومنابع پر پردہ پوشی نہ کر کے بڑی بے باکی سے اظہار بھی کیا ہے، خاص طور پر یہ اعتراف بڑی معنویت کا حامل ہے۔

خرد افزود مرا درسِ حکیمانہ فرنگ
سینہ افروخت مرا صحبتِ صاحب نظراں

یہاں بھی سرسید مرحوم کی اساسی تعلیم کی کارفرمائی نمایاں ہے، دین ودنیا اور مشرق ومغرب کی تفریق نے نوعِ بشر کو بڑا نقصان پہنچایا ہے، اقدار عالیہ ہی انسانی فلاح کے لیے ملزوم ہیں، باقی سب نخیلِ بے رطب کے مانند ہیں، سرسید نے تعلیم پر جو توجہ دی وہ اک

---

[1] حیات جاوید صفحہ ۳۴۳ (نقش ثانی) ۱۹۰۲ء، لاہور)

بدیہی حقیقت ہے، اقبال فکری تشکیل کے ابتدائی دور سے ہی اس کے نقیب نظر آتے ہیں۔
۱۸۹۷ء کی ابتدائی دور کی نظم ''فلاحِ قوم'' حذف شدہ کلام میں سے ہے، جس کے اشعار میں اسی بنیادی موضوع کو پیش کیا گیا ہے۔

جو دوڑ کے لیے میدانِ علم میں جائیں
سبھوں سے بڑھ کے رہے ان کے فہم کا گلگوں
دکھائیں فہم وذکا وہنر یہ اوروں کو
زمانے بھر کے یہ حاصل کریں علوم وفنون

۱۹۰۰ء کی اہم نظم ''نالۂ یتیم'' میں پیغمبرِ اعظم وآخرؐ سے عاجزانہ التماس ہے۔

اے دیارِ علم وحکمت قبلۂ امت ہے تو
اے ضیائے چشمِ ایمان زیبِ ہر مدحت ہے تو
اے کہ ہم نامِ خدا بابِ دیارِ علم تو
امّی بودی وحکمت رانمایاں کردہ
ہاں دعا کن بہر ما اے مایۂ ایمانِ ما
پر شود از گوہرِ حکمت سرِ دامانِ ما

یہی موضوع اسرار خودی میں فلسفیانہ اظہار کے ساتھ نمودار ہوتا ہے۔

حرفِ اقراء حق بہ ما تعلیم کرد — رزقِ خویش از دستِ ما تقسیم کرد
علم از سامانِ حفظِ زندگیست — علم از اسبابِ تقویمِ خودیست

متروک کلام میں ۱۹۰۲ء کی ایک اور طویل اور بے حد موثر نظم ''اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں سے'' کا ذکر بے محل نہ ہوگا بہت سے موضوعات ماضی وحال کے اس میں در آئے ہیں مگر دقیقہ سنجی اور دیدہ وری تشویقِ علم پر ہی ہے، آٹھویں بند کا اختتام حدیث پاک کے آفاقی ارشاد اور تاکید پر ہوتا ہے۔

جل کے مرجانا چراغِ علم پر مشکل نہیں
پہلے تیرے دل میں پیدا نورِ پروانہ تو ہو

اے کہ حرفِ اطلبوا لوکان بالسین گفتۂ
گوہرِ حکمت بہ تارِ جانِ امت سفتۂ

تعلیم کی یہی فضیلت ہے جوان کے نظامِ فکر میں مختلف پہلوؤں سے نقشِ حیات بن کر ابھرتی ہے۔ ہاں یہ نکتہ بھی پیشِ نظر رکھیے کہ یہ زمان ومکان کی تحدید سے آزاد ہے۔ جدید وقدیم دلیلِ کم نظری ہے تو مشرق ومغرب کا اطلاق بھی بے بصیری ہے، سرسید مرحوم کو مغربی تعلیم اور معیشت سے ایک گونہ انس رکھنے کی وجہ سے ہدفِ تنقید بننا پڑا، حالانکہ اچھے اقدار اور مثبت افکار کے حصول میں کوئی شے مانع نہیں ہے، کوئی ذی فہم اس کی تائید سے گریز نہیں کرے گا، اقبال کے نقادوں نے بھی ان کی مغرب سے بیزاری پر اکثر خفگی کا اظہار کیا ہے، اس انتقادی ابلاغ میں اقبال کے اس مرکزی خیال کو نظر انداز کیا گیا جس میں یہ نکات ثبت ہیں

کھلے ہیں سب کے لیے غربیوں کے مے خانے
علومِ تازہ کی سرمستیاں گناہ نہیں

یا ''شعاعِ امید'' کا آخری شعر

مشرق سے ہو بیزار، نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

یہ کلام ''ضربِ کلیم'' یعنی پایانِ عمر کا ہے۔

یا ایک تیسری تمثیل بھی قابلِ توجہ ہے، انہیں مثلِ شعاعِ آفتاب رکھنے والی نظر بہت عزیز ہے کیونکہ خود آفتاب مشرق ومغرب کو خاطر میں نہیں لاتا اور کائناتِ عالم کو روشن کرتا ہے۔

فطرتش از مشرق ومغرب بریست

شاہین ایک پسندیدہ پرندہ ہے کیونکہ وہ بھی پورب اور پچھّم کے قید وبند سے آزاد ہے۔

یہ پورب یہ پچھّم چکوروں کی دنیا
مرا نیلگوں آسمان بے کرانہ

یا

زد بانگ کہ شاہینم وکارم بہ زمیں چیست
صحراست کہ دریاست تہِ بالِ و پرِ ماست

اس خیال کی گہرائی اور بے کران کیفیات نے فکرِ اقبال کو آفاقی افق سے ہمکنار کیا ہے۔ جس کا ایک مصدر:

مسجدِ ماشد ہمہ روئے زمیں

جیسا بلیغ اشارہ ہے اقبال کے موقر پیشروؤں نے بھی اس عرفان کا احاطہ کیا ہے، مولانا حالی کا مشہور قول ہے۔

حالی اب آؤ پیرویٔ مغربی کریں

علامہ شبلی کو کم سواد تنقیدی نظر نے حریفِ سید قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ مغربی تہذیب کو بحرِ اوقیانوس میں غرقاب دیکھنا چاہتے تھے، علامہ شبلی کی نظر اتنی محدود نہیں ہو سکتی اور نہ ہی اس حقیقت سے اجتناب کر سکتی تھی۔ ہاں ہم نے شاید دانستہ طور پر اعراض کیا ہے، ان کے تصورات میں یہ نکتہ ایک اہم مقام رکھتا ہے۔

جادۂ مغربیاں گیر کہ ایں طرزِ نوی
دل پذیر است ودلآویز ودلآرا ماند

راقم اس راست بیانی اور جسارت کے لیے کسی اعتذار کا خواہاں نہیں ہے ہماری تنقیدی نظر ہو یا تفکیری بصیرت وہ ابھی تک چند مفروضات پر ہی منحصر ہے، سرسید اور اقبال کی بخشی ہوئی امکانی وسعتوں کی تفہیم وتوضیح کے لیے ہماری دانشوری ہنوز شرر سے شعلے تک رسائی کی محتاج ہے۔

سرسید نے تعقل پسندی پر خاص اہمیت دی اور بعضوں کے نزدیک تجاوز بھی کیا۔ اگرچہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ متکلمین کی روایات کی تجدیدِ نو انھیں کی مرہونِ منت ہے۔ اندازِ نظر بدل چکا تھا ایک نئی روشنی کی ضرورت تھی۔ سرسید مرعوب تھے اور نہ مسحور۔ ان کی چشمِ بینا دیکھ رہی تھی کہ صرف جذبات سے سروکار رکھنا ہلاکت کا موجب ہو سکتا ہے مذہبی اقدار کے ساتھ بصیرت کی نگہداری ہر بشر کے لئے مثلِ غذا مقام رکھتی

ہے۔ان دونوں کے عدل وتوازن سے ہی فکرِ انسانی کی ارتفاعیت ممکن ہے۔ بہ ظاہر اقبال کا رویہ عقلیت کے منافی ہے۔ جسے تعقل پسندی کہہ سکتے ہیں۔ ایسا بھی نہیں کہ انھوں نے اس کی افادیت اور انسانی معاشرے کی فلاح کے لئے ناگزیر نہ سمجھا ہو وہ اس کی ضرورت اور اہمیت کے معترف تھے۔ جسے حکمت ودانائی کے ساتھ پیش کرتے رہے۔ وہ عشق وعقل کے امتزاج اور ارتباط پر سنجیدہ فکر کا مطالبہ کرتے ہیں دونوں کے وجود کو ملزوم قرار دیتے ہیں۔

زیرکی از عشق گردد حق شناس
کارِ عشق با زیرکی محکم اساس
عشق با زیرکی ہم بر شود
نقش بندِ عالمِ دیگر شود

دونوں کے التفات اور پیوستگی سے ہی جہانِ نو کی تخلیق ممکن ہے۔ ان فکر انگیز خیالات کی موجودگی میں اقبال کو عقل دشمن نہیں کہا جا سکتا۔

ایک دوسرے پہلو سے بھی بہ غائر نظر مطالعہ کی ضرورت ہے۔ اقبال نے ۱۹۰۳ء میں مشہور نظم ''سید کی لوحِ تربت'' لکھی۔ اس کے مندرجات پر غور فرمائیں۔ سرسید کی تعلیمات اور پورے مشن کی تلخیص نصیحتوں کی صورت میں اقبال نے قلم بند کر دیا ہے یہ آوازِ درا ہے جو لوحِ تربت سے شاعر کے قلب ونظر کو جگر گداز بنا رہی ہے۔

فرقہ بندی کی لعنتوں سے حفاظت، تحریر کی حرمت، افسانہ ہائے عہدِ کہن سے گریز، بازوئے جگرداری کی چاہت کے ساتھ شعر کے معجزات سے مردہ دلوں کی مسیحائی کی تلقین سرسید نے کی ہے۔ جس رہ گزر پر اقبال تا دمِ آخر چلتے رہے۔ یہ اوائل زندگی کے افکار تھے۔ جب تصورات کا تلاطم سطحِ سمندر سے ابھرا نہیں تھا۔ اب اس تفکیری مصادر کے تسلسل کو پایانِ عمر کی تخلیقات میں ملاحظہ فرمائیں۔ جو تخلیق کا نہیں اس بزرگ شخصیت کے روحانی فیض کی معجز نمائی ہے۔ ''پس چہ باید کرد'' ۱۹۳۶ء کی تخلیق ہے۔ اقبال نے بیماری سے شفایابی کے لئے ہر طرح کی چارہ سازی کی مگر افاقے کی صورت نظر نہ آئی۔ ۳؍اپریل ۱۹۳۶ء کی شب میں سرسید احمد خاں خواب میں نمودار ہوتے ہیں اور نسخۂ شفا تجویز کرتے ہیں۔ ''فرمودند کہ از

علالتِ خویش در حضور رسالت مآبؐ عرض کن'' پھر نہ پوچھیے کہ اقبال کے جذب وشوق کا سیلِ بے اماں سید کونینؐ کے حضور تعظیم وتکریم میں سراپا محویت کا منظر پیش کیا ہے۔

در جہانِ ذکر وفکرِ انس وجاں　　تو صلوٰۃِ صبح تو بانگِ اذاں
ذکر وفکر وعلم وعرفانم توئی　　کشتی ودریا وطوفانم توئی
اے پناہِ من حریمِ کوئے تو　　من بامیدے دمیدم سوئے تو

اس مجموعہ کی یہ آخری نظم ہے جو باسٹھ (62) اشعار پر مشتمل ہے۔ غالبًا اسی نظم کی تحریک یا طفیل میں ''ارمغانِ حجاز'' بہ حضور رسالت مآبؐ اقبال کے حاصلِ عمر کا نذرانۂ عقیدت بن کر تخلیق کا باعث بنا۔ اجمالاً کہا جاسکتا ہے کہ اقبال کے فکری مصادر کی ابتدا اور غایت ونہایت میں سرسید کا فیضان بدیہی حقیقت کی حیثیت رکھتا ہے۔

اقبال کی غالب شناسی

غالبؔ و اقبالؔ کی عظمت کے اقرار و اعتراف میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ انکار تو کجا اشتباہ کی بھی گنجائش نہیں ہے۔ ان کی عظمت لازوال شہرت رکھتی ہے۔ دونوں نے بظاہر اپنے کو فرداکے فن کار کی صورت میں پیش کیا اور اس پر اصرار بھی کرتے رہے مگر واقعہ یہ ہے کہ دونوں نے زمان و مکاں کے فصلین کو مسخر کرلیا ہے اور اُن سے ماوراء ہیں۔ انھوں نے ہمارے شعر و ثقافت کو آفاقی اساس بخشا ہے۔ ہمیں دنیا کی بڑی تخلیقات کے رو برو اس شان سے لاکھڑا کیا کہ آنکھوں کو خیرگی نہیں ہوتی اور نہ شرمساری بلکہ ایک تفاخر کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ یہی نہیں بہ قول پروفیسر رشید احمد صدیقی ان کی وجہ سے بارگاہِ ایزدمیں بھی ہماری توقیر میں اضافہ ہوگا۔

میں عالمی ادب سے زیادہ واقف نہیں لیکن گوشۂ دل میں یہ گمان ضرور گزرتا ہے کہ کیا ان دونوں کی موجودگی ایک اعجوبہ نہیں ہے؟ اردو دنیا کی کم سن زبانوں میں سے ہے۔ اس کی کم عمری اور کم مائیگی کو دیکھئے۔ دوسری طرف عالمی میزان پر دو بڑے فنکاروں کے وزن و وقار کا اعتراف کیا دنیائے تخلیق کا معجزہ نہیں ہے؟ شاید ہی کسی ادب کو یہ منزلت میسر ہو۔ یہ مغلوں کی دین ہو یا مغربیوں کا فیضان سرزمینِ ہند کی

تاب کارزرخیزی کا یہ تخلیقی استعجاب فکر طلب ضرور ہے۔

بہ ظاہر یہ دونوں دو دارالخلافہ کے باشندے ہیں مگر بیسوں سلاطین وسلطنت سے سیراب ہیں۔تحریری حوالوں میں یہ کثرت آرائی موجود ہے کہ دجلہ و دنیوب و نیل ان کی زد میں ہے۔ یہی نہیں آفاق بھی اپنی ممکنہ جہات کے ساتھ ان میں گم ہے۔ وسعتِ نظر کی پہنائی میں ارض وسماء کی دنیا محدود نظر آتی ہے شاید اسی باعث دونوں جہانِ تازہ کی تعمیر میں سرگرداں ہیں۔اور اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کی اضطرابی آرزو میں سرشار دکھائی دیتے ہیں۔ان کی وسعت طلبی گماں آبادِ ہستی اور آفاقی حصار کیا عرش سے بھی پرے لے جاتی ہے۔ یہ تصور باید وشاید کہیں نظر آئے۔ یہ تصوّرات اس تہذیب کے طفیل ہیں جو زمان ومکاں کی ابدیت سے مستعار ہیں اور لامتناہی تسلسل کا نظری وفکری نکتہ فراہم کرتے ہیں۔اسی سے تخلیقی فعالیت کا سرچشمہ حسن آفرینی کے مرقعے تیار کرتا ہے۔ جو ابدیت کی حدوں کو چھوتا ہے۔اس عمل میں مرکزی محور ابنِ آدم کی ہے جو اپنی حدود میں خلق کی صفات رکھتا ہے۔اس شرف میں کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں ہے دونوں کی آفاقی برنائی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کے افکار میں انسان کو بڑی بزرگی اور برگزیدگی حاصل ہے۔کائنات اور انسان کا یہ بسیط تصور دونوں کو مشترک اقدار سے منسلک کرتا ہے۔محکومی کی پراگندہ فضا اور مغلوب قوم کی نفسیات میں اس بے کراں وسعت کی ترغیب ایک مستحسن فکری اقدام تھا۔جس کے نقیب غالب بھی تھے اور اقبال بھی۔ جسمانی اور جغرافیائی حد بندیوں سے مفر نہ ملنے کی صورت میں تمناؤں کی کھلی فضا میں دو سانس کی سیر بھی جنسِ نایاب تھی۔دونوں آزادی اور آرزومندی کے خواہاں تھے غالبؔ کی فضائے بسیط کا تخیلی تصور اقبال کے لیے بڑی کشش رکھتا ہے۔ ہر آن شانِ وجود کی صدا سے اقبال مضطرب ہیں۔اس شش جہت کی دنیا کو واہمہ قرار دیتے ہیں اور

جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود

پر اُن کا ایقان ہے اُس کی تخلیق وہ خود کرنا چاہتے ہیں۔

اس موضوع کو دوسرے رخ سے بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اقبالؔ غالبؔ کے ذہنی افق سے کہیں آگے ہیں۔ ان کی انفرادی تخلیقی توانائی کے علاوہ ان کا مطالعہ، معاصر فکری رویے، ملکی اور بین الاقوامی سیاست کی کشاکش کی وجہ سے یہ سبقت ایک فطری فیض ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اقبالؔ نے غالبؔ کی عظمت کو تسلیم کرنے میں بخل نہیں برتا۔ نہ ہی کسی تامل سے کام لیا۔ اقبالؔ نے تو غالبؔ سے بہت کم رتبہ کے شعراء سے اپنے عجز و نیاز کا اظہار کیا ہے۔ داغ تو استاد تھے امیر مینائی سے بھی اپنے اکتساب کا اعلان کیا ہے۔

عجیب شے ہے صنم خانۂ امیر، اقبال
میں بت پرست ہوں رکھ دی یہیں جبیں میں نے

بعض کم نظر اور اقبال سے عناد رکھنے والوں نے ''آرگنائزر'' میں اقبال سنگھ کے لغو مضمون کو بنیاد بنا کر اس شعر کی غلط تعبیر کی ہے۔ ان میں گاہا، خودساختہ شاگردِ اقبال رستوگی اور ترقی پسند شامل ہیں۔ دنیا جانتی ہے کہ ''آرگنائزر'' کیا ہے اور اس کے حوارئین کون ہیں؟ یہاں امیر مینائی کے سلسلے میں قدرے تفصیل سے گفتگو کا سبب معترقین ہی ہیں۔

یہ صرف شعری اعتراف نہیں ہے۔ بلکہ اقبال کا اقرار و یقین امیر مینائی کے بارے میں اس سے بھی زیادہ عقیدت و نیاز مندی کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ شروع شروع میں ان کی زبان و بیان پر اہل لکھنؤ نے بڑے سطحی قسم کے اعتراض کئے تھے۔ جنھیں دعوائے سخن دانی کے علاوہ لکھنؤ کی لسانی مرکزیت کا احساسِ بے جا ستا رہا تھا۔ ''تنقید ہمدرد'' کے فرضی نام سے کوئی صاحب ان اعتراضات میں پیش پیش تھے۔ اور

اخلاقی جرأت سے محروم بھی تھے۔ یا نا معلوم مصلحت کے شکار تھے۔ اس شعر پر بھی معترض تھے۔

آرزو یاس کو یہ کہتی ہے
اک مٹے شہر کا نشاں ہوں میں

نقاد کی نظر میں کوئی جگہ سے ہونا چاہئے۔ اقبال نے ان انتقادی مباحث کا بڑا مسکت اور مدلل جواب دیا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ عنفوان شباب تک ادبیات کی بے شمار کتابیں اقبال کے مطالعہ میں آچکی تھیں۔ خود اس تنقید کے جواب میں کلاسیکی شعراء کے کلام کی بیسوں مثالیں استناد کے طور پر پیش کی گئی ہیں یہ مضمون ۱۹۰۲ء یعنی اقبال کی جوبیس سالہ زندگی کا حاصل ہے۔ رضی دانش، مومن، آتش، ناسخ، داغ، جلال، سید احمد دہلوی (فرہنگ آصفیہ) سودا، مصحفی، میر، ظفر، خان آرزو، شیخ علی حزیں، مولانا صہبائی، عبدالوہاب نشاط شیرازی، انیس، حسرت موہانی، شمس الدین فقیر (ہدایت البلاغت) فردوسی، سعدی، مولانا جامی، شمس قیس خوارزی (حدایق المعجم) فوقی، نظامی، غالب، برق، حافظ، ظہوری، خاقانی، بیدل، ناصر علی، جلال اسیر، تسلیم، مجنوں، ملول لکھنوی، اور راقم مشہدی وغیرہ کے حوالے ان کی مطالعاتی نظر اور یادداشت کی دلالت کرتے ہیں۔ اس مضمون میں بعض فن کاروں کے کئی کئی حوالے مندرج ہیں۔ یہ مضمون اگرچہ بہت مختصر ہے۔ یعنی کل پندرہ صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں تقریبا 78 شعراء اور ادیبوں کے اقوال و اشعار بارِ ثبوت کے طور پر پیش کئے گئے ہیں۔ یہ اقبال کے ادبی انہماک اور تخلیقی سروکار کی ایک معمولی مثال ہے۔ مگر قاری یا ناقدینِ اقبال کے لئے حیرت فزائی کا جہان بے کراں کی حیثیت رکھتا ہے۔ اقبال کی کتب بینی اور ان کی تحریروں میں درآئی کتابیات پر ہنوز بڑی توجہ درکار رہے۔ تاکہ ان کے منابع ومصادر کے ساتھ اذکار و اشعار کی تخلیقی تہوں کی باز آفرینی کی جاسکے۔ اسی مضمون میں

امیر مینائی کے لئے اقبال نے عقیدت کے یہ القاب استعمال کئے ہیں۔

''فخر المتقدمین والمتاخرین حضرت امیر علیہ الغفران ایک مشہور غزل میں فرماتے ہیں۔

رکے راحت تو ملی پر ہے یہ کھٹکا باقی
آ کے عیسیٰ سرِ بالیں نہ کہیں قم مجھ کو''

دوسرا حوالہ بھی ملاحظہ ہو۔

''حضرت امیر روحی فداہ کا بھی ایک شعر یاد آ گیا

قاصد یہ زباں اس کی بیاں اس کا نہیں ہے
دھوکا ہے تجھے اس نے کہا اور ہی کچھ ہے''

تیسرا حوالہ بھی اس میں موجود ہے۔

''حضرت امیر مینائی مرحوم کا مطلع ہے''۔

چوتھے حوالے میں لکھتے ہیں

''حضرت امیر مرحوم کے اشارے سے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔''

اس گفتگو کے کئی پہلو پیشِ نظر ہیں۔ غالب کے علاوہ ان سے کم رتبے کے فن کاروں سے اقبال کی والہانہ وابستگی ان کی فکری صلابت وصحت مندی کی غماز اور ان کے فیضانِ نظر اور مطالعہ کی تکثیریت کے ترجمان ہیں۔ نیز ان کے استفادے کے ابعادِ بے کراں وسعتوں کے حامل ہیں۔ ایک اور زاویے سے بھی سوچنے کی ضرورت ہے۔ اقبال داغ کے شاگرد ہیں۔ اور داغ دکن میں نظام کے دامنِ دولت سے وابستہ ہیں۔ لاہور سے دکن کی دوری بھی کم نہیں ہے۔ امیر مینائی شمالی ہند میں مقیم ہیں نسبتاً نزدیک تر ہیں۔ مگر شاید داغ کی شہرت کے سبب اقبال نے ان سے دو تین غزلوں پر اصلاح لی۔ ان کی منزل پر ٹھہر جانا اقبال کے لئے درماندگی کا سب سے الم ناک حادثہ

ہوتا۔امیر و داغ معاصر تھے اور رشک و رقابت بھی رکھتے تھے۔معاصرانہ چشمک کو ہوا دینے سے اور مخالفانہ صف آرائی میں ہماری روایتوں کے مطابق شاگردوں کی ٹولیاں حرب وضرب سے بھی کام لیتی رہتی ہیں۔اقبال کی ژرف نگہی دیکھیے کہ وہ امیر مینائی کے لئے تبریک وتہنیت کے الفاظ پیش کرتے ہیں۔داغ کے مرثیہ کا یہ شعر بھی ممنونیت کا مظہر ہے۔

توڑ ڈالی موت نے غربت میں مینائے امیرؔ
چشمِ محفل میں ہے اب تک کیفِ صہبائے امیرؔ

راقم کو کبھی کبھی یہ خلش ستاتی رہی ہے کہ اقبال کے کلام میں عربی و فارسی انگریزی اور اردو کے بہت سے شعراء کے اسماء واشعار کا ذکر ملتا ہے۔میر وانیس کا ذکر نہیں ہوتا۔اس کے وجوہات بہت عیاں ہیں۔یاس ومحرومی یا گریہ والم اقبال کے عزم واستقلال کے منافی بلکہ متناقض ہیں۔اس مضمون میں میر وانیس کے کئی حوالے درج ہیں۔جن سے میری تشفی ہوئی کہ اقبال نے ان بڑے فن کاروں کا کلام بغور پڑھا ہے۔فکر ونظر کے اختراع وایجاب میں بُعد ایک بشری فطرت ہے۔لیکن اظہار وابلاغ کی ترسیلی صورتوں کے لئے راہیں تقریباً متعین ہیں۔لفظ ومعنی کے تعینات کی تعبیروں میں تبدیلی کا امکان رہتا ہے۔مگر ان کی حیثیت فروعات کی ہوتی ہے۔اصل الاصول کی نہیں۔اقبال فلسفۂ لسان کی ناگزیر معنویت سے واقف تھے۔زبان اور ابلاغ کی متحرک اور بدلتی ہوئی کیفیات کا بغایت نظر عرفان رکھتے تھے۔ان امور سے متعلق تمام جزئیات پر ان کی نظر تھی وہ لکھتے ہیں۔

”کیا تعجب ہے کہ کبھی تمام ملک ہندوستان اس (اردو) کے زیرِ نگیں ہو جائے ایسی صورت میں یہ ممکن نہیں کہ جہاں جہاں اس کا رواج ہو وہاں کے لوگوں کا طریقِ معاشرت،ان کے تمدنی حالات اور ان کا طرزِ بیان اس پر اثر کئے بغیر رہے۔علم السنہ کا

یہ مسلمہ اصول ہے۔ جس کی صداقت اور صحت تمام زبانوں کی تاریخ سے واضح ہوتی ہے۔ اور یہ بات کسی لکھنوی یا دہلوی کے امکان میں نہیں ہے کہ اس اصول کے عمل کو روک سکے"۔ ؎۱

فلسفۂ لسان یا علم السنہ پر اقبال کو بہ غایتِ کمال درک حاصل تھا ان کے کلام سے بہ خوبی اس کا یقین ہوتا ہے لفظوں کے استعمال اور اختراع میں اقبال بذات خود ماہر و مکتفی تھے۔ اس لسانی فیضان سے فارسی و اردو میں اس حد تک شاید ہی کوئی مستفیض ہو۔ ساتھ ہی ان کی تنقیدی نظر بھی کسی دوسری تمثیل سے تہی دامن ہے۔ فن اور فن کار کے رشتوں اور دونوں کی ذمہ داریوں پر ایسے انکشافات، قبل اور مابعد کے انتقاوی ادب میں ناپید ہیں ان کے اقوال و افکار کی اقتد اتو کی گئی۔ مگر تنقیدی مزعومات ان سے سبقت نہ لے جا سکے۔ ۱۹۰۲ء کی اس عبارت کے انتقادی جملے غور طلب ہیں۔

"فن تنقید کا پہلا اصول یہی ہے کہ اس کا ہر لفظ نفسانیت کے جوش سے مبرا ہو"۔

"آپ مطمئن رہیں مجھے اساتذہ کی ہمسری کا دعویٰ نہیں ہے۔ اگر اہلِ پنجاب مجھ کو یا حضرتِ ناظر کو بہمہ وجوہ کامل خیال کرتے ہیں تو ان کی غلطی ہے زبان کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے اور یہ ایک ایسی دشوار گزار وادی ہے کہ بالخصوص ان لوگوں کو جو اہلِ زبان نہیں ہیں یہاں قدم قدم پر ٹھوکر کھانے کا اندیشہ ہے۔ قسم بخدائے لایزال میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ بسا اوقات میرے قلب کی کیفیت اس قسم کی ہوتی ہے کہ میں باوجود اپنی بے علمی اور کم مائیگی کے شعر کہنے پر مجبور ہو جاتا ہوں ورنہ مجھے نہ زبان کا دعویٰ ہے نہ شاعری کا۔ راقم مشہدی میرے دل کی بات کہتے ہیں"۔

من نیم در شمار بلبلاں اما بایں شادم
کہ من ہم در گلستانِ قفس مشت پرے وارم ؎۲"

؎۱ اقبال کے نثری افکار ص ۳۴ ؎۲ اقبال کے نثری افکار ص ۴۹

اقبال انتہائی عاجزی سے مقر ہیں کہ استادانِ فن کے ساتھ دعوائے ہمسری گمرہی کے سوا کچھ نہیں اسی طرح زبان دانی اور شاعری کی ادعائیت بھی فریب ہی فریب ہے۔ خطوط کے علاوہ نزولِ شعر کی الہامی کیفیت پر پہلی بار اس مضمون میں اعتراف ملتا ہے۔

اقبال کے شعری مناسبات کا مطالعہ بھی بہت ہی دلچسپ اور ہماری حیرتوں میں اضافے کا امکان رکھتا ہے۔ اس سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ ان کا کلام مستعار ومستفادفن کا مجموعہ ہے۔ استنباط اور استفادے کی یہ بے کراں بوقلمونی ان کے مطالعے ومشاہدے اور امعانِ نظر کی شہادتیں پیش کرتی ہیں۔ اس معاملے میں بھی ان کا نہ کوئی حریف ہے اور نہ حلیف۔ نہ پیشرو اور نہ ہی پیرو۔ یکتائی اقبال کی یہ جلوہ سامانی فن کے بساطِ دہر پر بہت دنوں تک باقی رہنے کا اعلانیہ ہے۔ سو سال کے انتقادی پیچ وخم اور نشیب وفراز کے احتراز واعتراف نے اس اعلانیے کی توثیق کردی ہے۔ ان کی لازوال مقبولیت کی مہر اثباتِ جاوداں بن چکی ہے۔

تخلیق کاروں کے تذکرے سے کلام اقبال سماوی ستاروں کی ایک ایسی روشن سبیل کی صورت اختیار کر چکا ہے جس کے سامنے انتقادی عقل وخرد کی ایک بھی نہیں چل پاتی۔ اس بے چارگی کے لئے اعتراف کے علاوہ عافیت میسر نہیں ہوسکتی۔ بعض سخت گیر ناقدین کی ابتدائی تحریریں اور پایانِ عمر کے اعتراف کا تضاد شاید اسی وجہ سے ظہور میں آیا ہے۔

راقم کا یقین ہے کہ ان حوالوں کی تکثیریت میں غالب منفرد فن کار ہے جس کا ذکر اقبال کے ہر دور کی تحریر میں کسی نہ کسی صورت اور عنوان موجود ہے اس سے لگتا ہے کہ غالب کے قرب کی قندیل سے اقبال نے اپنی گزرگاہِ خیال کو ہمیشہ فروزاں رکھا جو شہر آرزو کی عظمتِ رفتہ کے ماتم خانے میں بھی شمع بن کر روشنی بکھیرتا رہا۔

مرثیۂ داغ کا مطلع ہمیں بہ غور ملاحظہ کی دعوت دیتا ہے۔

عظمتِ غالب ہے اک مدت سے پیوندِ زمیں

اپنے یقین کے اثبات میں بیسویں صدی سے قبل کی تخلیقات میں غالب کے حوالوں کا ذکر کرتا رہا ہوں۔ اب اوائل صدی کے اندراجات ملاحظہ ہوں۔ جو ۱۹۰۲ء کے ہی ہیں۔ اپنے تنقیدی مباحث میں غیر متحرک روی کے جواز میں فصحا کا دستور العمل پیش کرتے وقت فوقی یزدی نظامی اور سودا کے ساتھ غالب کا شعر بطور سند پیش کیا ہے۔

بے فروغیکہ چوں بردمد
زسیمائے مے خارہ نیّر دمد

دوسری جگہ اضافتِ بیانی کی سند میں غالب کا شعر مرقوم ہے۔

کمال گرمئ تلاشِ دید نہ پوچھ
بسانِ خار مرے آئینہ سے جوہر کھینچ

نظم کے ساتھ ساتھ ڈائری کے اقتباسات سے بھی بڑی تقویت ہوتی ہے۔ جس کا ذکر بعد میں آئے گا۔ ۱۳؍دسمبر ۱۹۱۶ء ''وکیل'' امرتسر میں اقبال کا ایک مضمون ''تصوفِ وجودیہ'' کے بارے میں شائع ہوا تھا۔ جو آنحضرتؐ کی حدیث پاک میں آئے لفظ 'سمن' کی توضیحات سے متعلق ہے۔ اس لفظ پر تحقیق کرتے ہوئے اقبال نے سند کے لئے غالب کا شعر نقل کیا ہے۔

رخشندۂ ستارا از رخِ ناشستہ صنم
بالا بنفشہ از قد خم گشتۂ سمن

ان اشعار کے استعمال اور استدراک سے غالب کے فارسی و اردو کلام کے گہرے مطالع اور موثرات کا اندازہ ہوتا ہے۔

مجنوں گورکھپوری کے حوالے سے یہ کہنے میں عار نہیں کہ اقبالؔ نے مولانا رومی سے جس نیازمندی کا اظہار کیا ہے اس میں بے جا عقیدتمندی شامل ہے۔ اس سے اقبال کی مفکرانہ عظمت کو نقصان پہنچا ہے۔ ان مباحث سے قطعِ نظر اقبالؔ کی علمی دیانت داری دیکھیے کہ وہ اپنے تصورات کو دوسروں سے بھی منسوب کرتے ہیں۔ اس نسبت میں ان کے قلب ونظر کی فراخی بھی شامل ہے۔ اس نوع کا اظہار اقبالؔ ہی کر سکتے تھے۔

خرد افزود مرا درسِ حکیمانہ فرنگ
سینہ افروخت مرا صحبتِ صاحب نظراں

غالب نے بھی کما حقہ اعتراف کیا ہے۔ ہاں کہیں ان کی شوخی نے عجب لطف دیا ہے۔ سرقے وتوارد کے اتہام کو جس خوب صورتی سے غالبؔ نے نبھایا ہے وہ صرف غالب کو ہی زیب دیتا ہے۔

گماں مبر کہ توارد یقیں شناس کہ دزد
متاعِ من زنہاں خانۂ ازل بردست

مگر غالبؔ نے صدقِ دل سے اپنے اکتساب اور عجز دونوں کا برملا اظہار بھی کیا ہے۔

نگویم تازہ دارم شیوۂ جادو بیاناں را
دلے در خویش بینم کارگر جادوئے آناں را

اقبالؔ کی طرح غالبؔ نے بھی ظہوری، نظیری، عرفی، بیدل کی حکیمانہ بصیرتوں اور فنی کمالات کو تسلیم کیا ہے۔ ہوتا بھی ہے کہ فکر انسانی کا یہی تسلسل ہے جو فکر ونظر کو آگے کی طرف جولاں رکھتا ہے اور ماضی کے احوال وافکار سے سیرابی بھی حاصل کرتا رہتا ہے۔ نہ فکر جامد ہے اور نہ فن۔ دونوں رواں دواں رہتے ہیں۔ اسی سے اکتسابات کا عمل نئے تخلیقی اُسلوب اختیار کرتا رہتا ہے۔ یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ اقبال کی

رہبری غالبؔ کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں کرسکتا تھا۔ وہ جن تصورات کے حامل تھے اور ان کے لیے اظہار کا جو پیرایۂ بیان درکار تھا غالبؔ ہی کفالت کرسکتے تھے۔ اسی لیے غالب سے استفادے کے علاوہ اردو کے دوسرے شعراء کا حوالہ یا اخذ واستنباط کا اشارہ نہیں ملتا۔ یہ نکتہ بھی ذہن میں رکھیے کہ فکر ونظر کے عمیق عنوانات کے ابلاغ کے لیے میر امنؔ، میر تقی میر، انشاؔ، ذوقؔ اور داغؔ کی زبان ساتھ نہیں دے سکتی۔ لفظ ومعنی کی ایک دوسری دنیا کی ضرورت نے غالبؔ کو مجبور کیا کہ وہ روشِ عام سے ہٹ کر بیدل کی پیچیدہ گوئی میں پناہ لیں۔ لفظیات کی یہ تراشیدگی اور مفہوم کی گراں باری سے آہنگ کو متحمل کرنا معمولی ذہن کا کام نہ تھا۔ چنانچہ خود غالبؔ کو احساس تھا کہ خیالات کے تلاطم کے لیے الفاظ کا جامہ تنگ نظر آتا ہے

کروں خوانِ گفتگو پر دل وجاں کی میہمانی

اقبالؔ کے مشاہدے میں ترسیل کی یہ ناکامی کبھی کبھی نالہ دل دوز بن کر نمایاں ہوتی ہے۔

حقیقت پہ ہے جامۂ حرف تنگ ‏ ‏ ‏ ‏ حقیقت ہے آئینہ گفتار زنگ
فروزاں ہے سینے میں شمعِ نفس ‏ ‏ ‏ ‏ مگر تابِ گفتار کہتی ہے بس

یا اس سے زیادہ بلیغ اور بے کسی کا اظہار اس شعر میں ہے

درحرف نمی گنجد ایں معنیٔ پیچیدہ ‏ ‏ ‏ ‏ یک لحظہ بدل درشو شاید تو درائی

لفظ ومعنی کے اس رشتے کو نظر میں رکھیں تو غالبؔ واقبالؔ کے اسالیب کا تنوع اور دیر پا تاثر ذہن نشیں ہو سکے گا۔ دونوں کو ایک نئی زبان، نیا آہنگ اور نیا شعری سانچہ ڈھالنا پڑا۔ جس میں لفظوں کے معانی میں وسعت کے ساتھ پگھلنے کی کیفیت عام ہے۔ دونوں فن کار فکر کے ابلاغ میں کامیاب ہیں۔ اس کا سبب بھی آپ کے سامنے ہے۔ یہ محض حاشہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ دونوں ذولسان

شاعر ہیں۔ اور زبانوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ دونوں نے یہ میزانِ تخلیق بھی قائم کیا ہے کہ اردو میں اسی ادیب کو عظمت ملے گی جو فارسی و عربی زبانوں کا مزاج داں ہوگا۔ یہ وہ پیمانہ ہے جس پر فن کے بقا کا انحصار ہوگا غالباً یہی اسباب ہیں جو اقبال کو غالبؔ سے قریب کرتے ہیں۔ غالبؔ طرزِ بیدل کے دل دادہ ہیں۔ اردو میں میر تک ان کی رسائی ناسخ کے توسط سے ہے۔ یہ بھی بلاوجہ نہیں ہے۔ بیدل کے بعد کون ہے جو غالبؔ کے مزاج کو راس آتا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بیدل اقبال کو بھی بہت پسند ہیں۔ حد یہ ہے کہ بیدل کا ابہام بھی اقبال کو عزیز ہے۔ اور وہ شاعری میں ابہام کی اہمیت کو ایک امر واقعہ تصور کرتے ہیں۔ کیا یہ ادبی تخلیق کا اعجاز نہیں ہے کہ تفکر اور طرزِ اظہار کی اتنی قربت کے باوجود اقبال نے اپنا الگ مقام پیدا کیا اور غالبؔ سے آگے گامزن ہوئے۔ کوئی دوسرا شاعر ہوتا تو وہ اپنی ندرتِ فکر و اسلوب کا سفینہ ڈبو چکا ہوتا۔ اس کی حیثیت نقشِ کفِ پا کی بھی نہ ہوتی۔ دنیائے ادب میں متعدد فن کار اس سانحے کے شکار ہوکر گم نامی کے قعر میں گرے اور جاں بر نہ ہو سکے۔

میرے نزدیک اقبال کی آفاقیت اور عظمت کی یہ بڑی کرشمہ سازی ہے جسے بغیر حجت و براہین کے تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ متنوع اور متضاد افکار کے ساتھ مختلف اسالیب کی آمیزش سے اقبال کے فکر و اظہار کی ساخت ہوتی ہے۔ یہ بھی ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ دوسرے افراد و اسالیب کے برعکس مرشدِ روشن ضمیر یعنی مولانا روم اور غالب سے اقبال کی والہانہ شیفتگی کا سلسلہ ہر دور میں قائم رہتا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ اقبال کی فکر کے مختلف ادوار ہیں اور وہ بہتر سے بہتر صورت گری کے لئے ہمیشہ آگے بڑھتے رہے خیالات سے ترکِ تعلق بھی کرتے رہے اور رجوع بھی۔ نت نئے مشاہدے اور ان کے عواقب انھیں مجبور کرتے رہے کہ وہ فکرِ فروزاں کی تکمیل کے لیے تلاش جاری رکھیں۔ شاعری یا فکر کا ابتدائی دور دیکھیں آپ باور کریں گے کہ غالبؔ سے اقبال کی

ذہنی مناسبت کتنی معنی آفریں ہے۔ آغازِ شاعری سے لے کر پایانِ عمر تک غالبؔ سے ان کی عقیدت قائم رہتی ہے۔ اسے آپ معمولی بات نہ سمجھیں۔ اقبالیات کے مطالعہ میں اس ارتباط کی بڑی اہمیت ہے۔ اقبال انیسویں صدی کے آخری دہائی میں فکرِ سخن کی طرف مائل ہوتے ہیں۔

سن ۱۹۰۰ء کی ایک مشہور نظم ''ابرِ گہر بار'' ہے حضور سید کونین ؐ کی شان میں یہ نظم فریادامت کے نام سے منسوب ہے۔

تیری الفت کی اگر ہو نہ حرارت دل میں
''آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا''

بحر و قافیہ کے علاوہ کئی مفاہیم کے ساتھ اس بند کی لفظیات میں غالبؔ کی آوازِ بازگشت سنائی دیتی ہے۔ شہادت گہہ (قتل گہہ) آساں، برقِ نگہ (تقاضایِ نگہ) شوق (دیوانگیٔ شوق) قصر (کاشانہ) نظارۂ رخسار (عید نظارہ) ویراں (خرابی) حیراں (حیراں) چلمن (جلوہ) کے علاوہ ذرا مصرعوں کو ملاحظہ فرمائیے۔

لطف دیتا ہے مجھے مٹ کے تری الفت میں
(لے گئے خاک میں ہم داغ تمنائے نشاط)
کبھی چلمن کو اٹھانا کبھی پنہاں ہوتا
(آپ جانا ادھر اور آپ ہی حیراں ہونا)

اس سے آپ کو اندارہ ہوگا کہ اقبال کی یہ پسندیدگی بلا سبب نہیں ہے اقبال کی دوسری نظم جو شمع کے عنوان سے دسمبر ۱۹۰۲ء میں مخزن میں شائع ہوئی تھی۔ پہلے ہی بند کا ٹیپ کا شعر ہے۔ جو بعد میں بانگِ درا کی ترتیب کے وقت حذف کر دیا گیا۔

از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ
طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

۱۹۰۱ء کی ان کی یادگارِ زمانہ، غالبیات میں سب سے مہتم بالشان خراجِ عقیدت سے معمور اور غالبؔ شناسی میں سنگ میل کی حیثیت رکھنے والی نظم "مرزا غالبؔ" ہے۔ جس کے پہلے ہی بند میں دیوانِ غالبؔ کا پہلا شعر ٹیپ کا بند تھا جو بعد میں شامل نہ ہو سکا۔

ہماری ادبی تاریخ میں دو اساتذہ کے اسمائے گرامی شاگردوں کی ذہنی تربیت اور فکری تشکیل میں بے نظیر ہیں۔ مولانا فاروق کو مولانا شبلی کی نشو و نما میں اور مولانا میر حسن کو اقبال کی تربیت میں بڑا دخل ہے۔ اقبالؔ نے بھی کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔

وہ شمع بارگہِ خاندانِ مرتضویؓ
رہے گا مثلِ حرم جس کا آستاں مجھ کو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی
بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجھ کو

مولانا سید میر حسن تبحر علمی کے ساتھ ادبیات سے شغف رکھتے تھے اور تخلیقی ہنر مندی کے رمز شناس بھی تھے۔ ساتھ ہی افکار و نظریات کے مختلف دبستانوں پر گہری نظر کے مالک تھے۔ اقبال نے لکھا ہے کہ وہ مسائل دقیقہ یا فلسفہ کے مہمات مسائل پر جب الجھتے تو سیالکوٹ آ کر مولانا سے رجوع کرتے اور مولانا سے ان کی تشفی ہوتی۔ ان امور سے قطع نظر مولانا بے حد روشن خیال اور وسیع المشرب بھی تھے۔ اندازہ لگائیے کہ پنجاب کے علما مل جل کر سر سید احمد خاں اور ان کی تحریک کی مخالفت پر آمادۂ پیکار تھے۔ مگر مولانا سید میر حسن سر سید کے مداحوں اور میزبانوں میں تھے۔ وہ سر سید کے ساتھ علی گڑھ کے لیے چندہ بھی فراہم کرتے۔ سر سید کے استقبال میں انھوں نے ایک عربی قصیدہ بھی لکھا تھا۔ مکاتیب سر سید کے مطالعہ سے بھی اس تعلق پر بڑی روشنی پڑتی ہے۔ اقبال علی گڑھ تحریک سے مولانا کے توسط سے روشناس ہوئے۔ اس کا قوی امکان ہے کہ غالبؔ سے پسندیدگی کی ایک وجہ مولانا کی ذات بھی ہو سکتی ہے۔ سر سید تو

غالب کے نیاز مندوں میں ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ سر سید کی تاریخی ترتیب کو غالب نے استحسان کی نظر سے نہیں دیکھا اور تقریظ میں ماضی پرستی کو فعلِ عبث قرار دیا۔

مردہ پروردن مبارک کار نیست

ماضی بہ عنوانِ دیگر تقلید پرستی ہے۔ جو غالؔب کی اجتہاد پسند طبیعت کے منافی ہے۔

چہ خوش بودے اگر مرد نکو پے — زبند پاستاں آزاد رفتے
اگر تقلید بودے شیوۂ خوب — پیمبر ہم رہِ اجداد رفتے

با من میاویز اے پدر فرزندِ آدم نکرد
ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نکرد

اقبالؔ تو خودکشی کو تقلید پر ترجیح دیتے ہیں۔

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی
رستہ بھی ڈھونڈھ خضر کا، سودا بھی چھوڑ دے

مگر اقبالؔ کی فکری صمیمیت اور اعتدال پسندی نے اِسے مخصوص نظامِ فکر سے مربوط کیا ہے۔

زاجتہادِ عالمانِ کم نظر — اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر

میرا قیاس ہے کہ مولانا میر حسن نے تخلیقی تربیت میں اقبالؔ کو مطالعۂ غالب کی تحریک دلائی ہو۔ یہ بھی امکان ہے کہ مولانا گرامی نے مزید مہمیز کیا ہو۔ ان قیاسات سے قطع نظر حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۹۷ء سے ۱۹۰۱ء تک تین سال یا چار سال کا درمیانی وقفہ غالب شناسی کا نقطہ آغاز ہے وہ ابتداء جو اپنے باطن میں بلندی کی معراج رکھتا ہے۔ یادگارِ غالب ۱۸۹۷ء میں شائع ہوئی اور اقبال کی نظم مرزا غالب مخزن ستمبر ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی اگر مرثیۂ غالب کو نظر انداز کر دیں تو اقبال کی یہ نظم حالؔی کے بعد کسی بڑے شاعر کا پہلا خراج عقیدت ہے جو غالب کے فکر و فن کو نئی معنویت کے ساتھ پیش

کرتا ہے۔ اس نظم میں پانچ بند تھے۔ بانگِ درا کی ترتیب کے وقت دوسرا بند حذف کردیا گیا اور ایک نیا بند لکھ کر شامل کیا گیا۔ حذف شدہ بند کے اشعار قابلِ ذکر ہیں۔ کیوں کہ اقبال نے دیوانِ غالبؔ کا پہلا اور مفہوم کے اعتبار سے مختلف المعنی کا حامل شعر ٹیپ کا شعر قرار دیا گیا تھا۔

معجز کلک تصور ہے یا دیواں ہے یہ
یا کوئی تفسیر رمز فطرتِ انساں ہے یہ
نازشِ موسیٰ کلامی ہائے ہندوستاں ہے یہ
نورِ معنی سے دل افروزِ سخنداناں ہے یہ
نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

اس نظم میں اقبال نے چار نکتوں پر خاص توجہ دی ہے۔ غالبؔ کا تفکر یا تخیل اور اس کی عظمت پر اظہار اور اقرار ملتا ہے۔ جیسے فکرِ انساں، مرغِ تخیل، فردوسِ تخیل، کشتِ فکر، رفعتِ پرواز، فکر کامل وغیرہ۔

دوسرا پہلو غالبؔ کی اندروں بینی ہے جو پردۂ وجود کو چیر کر اسرارِ حیات کا انکشاف کرتی ہے جیسے روح، پنہاں، مستور، مضمر، اعجاز، دل افروز، نورِ معنی، رمزِ فطرت، محوِ حیرت، نگاہِ نکتہ بیں، ذرّے ذرّے میں خوابیدہ شمس و قمر، سوادئ دل، خاک میں پوشیدہ لاکھوں گہر، دفنِ فخرِ روزگار کے استعاروں اور کنایوں میں بیان کیا گیا ہے۔

تیسرا نکتہ وہ ثقافتی روح ہے جس کی ترجمانی میں کلامِ غالب وقف ہے جسے نظر انداز کر کے نہ تو اس تخلیق کو سمجھنا ممکن ہے اور نہ تخلیق کار کو۔

نازشِ موسیٰ کلامی ہائے ہندوستاں ہے یہ
خندہ زن ہے غنچۂ دلّی، گلِ شیراز پر

اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ، کیا ہوگئی ہندوستاں کی سرزمیں، جہاں آباد گہوارۂ علم و ہنر، سراپا خاموش تیرے بام و در، ذرے ذرے میں ترے خوابیدہ ہیں شمس وقمر، پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گہر، دفن تجھ میں ہے فخر روزگار، جو آبدار موتی کے مانند ہے۔

حیرت ہوتی ہے کہ غالبؔ پر سب سے اچھی کتاب یادگارِ غالبؔ سمجھی جاتی ہے اور سچائی بھی یہی ہے مگر حالیؔ نے فکر کی عظمت، تفکر، تخیل کی بلند پروازی، فکر کامل، فردوسِ تخیل مختصراً غالبؔ کی عظمتِ فکر اور تخیل کی بلند پروازی کا ذکر نہیں کیا ہے۔ ہاں نادر خیال، نیا خیال، اچھوتا خیال جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ یہ اقبال اور صرف اقبال ہیں جنہوں نے پہلی بار غالب کے فکری ارتقاع پر توجہ دلائی ہے۔ اسی طرح اقبال نے غالب کی نگاہِ نکتہ بیں، تفسیر رمز فطرتِ انساں، فن کی معجز نمائی، شوخی تحریر میں رمزِ حیات کی پہنائی کا بھی ذکر کہیں نہیں ملتا۔ تیسرا پہلو بھی اقبال کا اختراعی اظہار ہے۔ یعنی فن اور فنکار کو ثقافت کے آئینہ خانہ میں اس سے قبل دیکھنے پر اصرار اقبال کی انتقادی بصیرت کی شناخت ہے جسے آج کے نظریہ ساز ناقد برتنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔

ع خندہ زن ہے غنچۂ دلّی گلِ شیراز پر

گلِ شیراز کے بارے میں ڈاکٹر سید عبداللہ نے سعدی، حافظ اور عرفی کا نام لیا ہے یہاں عرفی کی نشان دہی کی ہے۔ اس نظم میں پیش کیا گیا آخری نکتہ ہمارے نزدیک بہت اہم ہے اور دور رس امکانات کی طرف رہ نمائی کرتا ہے۔ خود اقبال کی نکتہ رس طبیعت کا ادراک ہے۔ غالب کو اب تک فارسی شعراء کا ہم دوش بتایا گیا تھا مگر اقبال نے گلشن ویمر میں خوابیدہ گوئٹے کا ہم نشیں قرار دے کر غالبؔ کو آفاقی حدود تک لے جانے میں سبقت لی ہے۔ یہ بات اقبال سے پہلے نہ حالی کی زبان سے سنی گئی اور نہ بعد کے زمانۂ قریب میں۔ اقبال کا یہ قول ان کی شعوری اور سمجھی ہوئی سچائی ہے اور

روشن دلیل بھی ہے جس کا سہارا لے کر ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے ایوانِ تنقید کا بلند مینار تعمیر کیا اور غالبؔ کو مفکرینِ مغرب کے روبرو بٹھایا۔ میں سمجھتا تھا کہ شاید ۱۹۲۴ء میں ترتیب نو کے وقت نظم میں یہ شعر اضافہ کیا گیا ہو مگر ایسا نہیں ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اقبال ۱۹۰۱ء میں گوئٹے سے واقف تھے اور غالب کو گوئٹے کا ہم نوا سمجھتے تھے۔ اردو میں یہ پہلی آواز تھی۔ اور پہلا تقابل۔ یوں بھی اقبال کو بہت سی اولیات حاصل ہیں ان میں یہ بھی اہم ہے۔

یہ امر بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ ڈاکٹر بجنوری ایک جواں سال، نئی تعلیم سے بہرہ مند او بہت باصلاحیت انسان تھے۔ اقبال سے ان کے مراسم اور ذہنی تعلق کی بنا پر یہ کہنا مناسب ہوگا کہ وہ اقبال کے خیالات سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے ''اسرار ورموز'' پر انگریزی میں مضامین لکھے۔ وہی ڈاکٹر بجنوری ہیں جنھوں نے ۱۹۱۸ء میں محاسنِ کلام غالب لکھ کر غالبؔ شناسی میں ولولۂ تازہ پیدا کیا۔ میرا معروضہ یہ ہے کہ حالی اور بجنوری کے درمیان اقبال ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں بالفاظ دیگر حالی کے بعد اقبال نے غالبؔ شناسی کی راہیں کشادہ کیں یا تحریک پیدا کی۔ یا توجہ دلائی۔ ان کی مفکرانہ اور شاعرانہ حیثیت مسلم ہے۔ مگر غالبؔ شناسی کی تاریخ میں اقبال ایک اولیٰ مقام بھی رکھتے ہیں۔ اس بات پر خندہ زن یا متحیر ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور میرے نزدیک اقبال سے بڑھ کر نہ کوئی غالبؔ شناس ہوا اور نہ ہی غالب کی صحیح منزلت سے آگاہ ہوسکا۔ اقبال کو قدرت نے وجدانی فکر ودیعت کی تھی اور بڑی فیاضی کے ساتھ بخشی ہوئی اس دولتِ بیدار کو اقبال بروئے کار بھی لائے۔ اقبال ہر دور میں غالب سے قریب تر ہوتے گئے۔ اور اس مقام تک لے گئے جہاں دوسرے ناقدین گزر بھی نہ کرسکے۔ بانگِ درا کے ابتدائی دور کی ہی نظم ''داغ'' ہے نظم کا پہلا ہی مصرع عظمت غالبؔ کے اعتراف میں ہے۔

عظمتِ غالب ہے اک مدت سے پیوندِ زمیں

اس نظم کے چند اشعار متروک قرار دئے گئے۔ جن میں یہ شعر بھی زد میں آ گیا۔

جوہر رنگیں نوائی پا چکا جس دم کمال
پھر نہ ہو سکتی تھی ممکن میر و مرزا کی مثال

یہ نظم ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی۔ وہ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک یورپ میں قیام پذیر تھے اور گہرے مطالعہ میں منہمک۔ گوئٹے کو بالاستیعاب پڑھا اور تقابل و تفکر کا سلسلہ جاری رہا۔ واپسی کے بعد بھی وہ گوئٹے کے مزار کی زیارت کا ارمان رکھتے تھے ۱۹۱۴ء کے ایک خط میں مس ویگے ناست کو لکھا ہے کہ اگر یورپ آیا تو اس عظیم فن کار گوئٹے کے مزارِ مقدس کی زیارت کو جاؤں گا۔

اقبال کے فکری سفر کی دلچسپ داستان کے سنجیدہ مطالعے میں ان کی شاعری، خطوط، مضامین، خطبات، ملفوظات کے ساتھ ان کی مختصر ڈائری کے مندرجات پر توجہ بہت ضروری ہے۔ اس میں قلب و نظر کی بعض ایسی کیفیات کا ذکر ہے جو دوسری تحریروں میں ناپید ہیں۔ یہ ۱۹۱۰ء کے چند ماہ میں لکھی گئی تحریروں کے شذرات ہیں جنھیں Stray Reflection کے نام سے ۱۹۶۵ء میں جاوید اقبال نے شائع کیا تھا۔ اس ڈائری یا نوٹ بک میں غالبؔ کے بارے میں پیغمبرانہ پیشین گوئی بھی ہے جو زمانہ مابعد میں حرف بہ حرف ثابت ہوئی۔ ۱۲۵ عنوانات میں سے صرف دو پر اکتفا کروں گا جن میں غالبؔ کے عبقری ذہن اور اس کے اثرات کا ذکر ہے۔ اقبال کو یقین ہے کہ غالبؔ کا اثر نفوذ زمانے کے ساتھ بڑھتا جائیگا۔ شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

As far as I can see Mirza Ghalib the Persian poet is probably the only permanent contribution that we Indian Muslims have made to the general Muslim literature. Indeed

he is one of those poets whose imagination and intellect place than above the narrow limitations of creed and nationality. His recognition is yet to came.

دوسرا عنوان

ہیگل، گوئٹے، غالبؔ بیدلؔ اور ورڈس ورتھ۔۔۔۔۔

"مجھے اعتراف ہے کہ میں نے ہیگل، گوئٹے، غالبؔ، بیدلؔ اور ورڈس ورتھ سے بہت کچھ لیا ہے۔ اوّل الذکر دونوں شاعروں نے اشیاء کے اندروں تک پہنچنے میں میری رہبری کی۔ تیسرے اور چوتھے نے (غالب و بیدل) مجھے یہ سکھایا کہ شاعری کے غیر ملکی تصورات کو جذب کرنے کے بعد بھی جذبہ و اظہار میں کیسے مشرقیت کو برقرار رکھا جاسکتا ہے اور موخر الذکر نے میری طالب علمی کے زمانے میں مجھے دہریت سے بچالیا۔"

اقبال کے ان تصورات کی روشنی میں غالبؔ پر انتقادی نظر ڈالنے سے پہلے ہماری ذمّہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔ تفہیم غالب کا مسئلہ بہت ہی پیچیدہ اور پر خطر ہے۔ مطالعہ اور مشاہدہ کی بے پایانی کے ساتھ ادب و دانش اور اسالیب و افکار کے سیل سے سروکار پڑتا ہے۔ تب ہی شاید گوہر مراد یا شاہد معنی ہاتھ آئے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اقبال کے یہ فکری ارتعاشات منظر عام پر آئے اور عوام و خواص نے استفادہ کیا۔ ظاہر ہے کہ اس ڈائری کی اشاعت بہت بعد کی ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ اقبال کے خیالات سے رو شناسی ہوتی ہو۔ کم سے کم ۱۹۲۸ء کی یہ تقریظ جو مرقع غالب میں موجود ہے۔ ڈائری کے بنیادی خیالات اس تقریظ میں موجود ہیں۔

The spiritual health of a people largely depends on the kind of inspiration which their poets and artists recieve. But inspiration is not a matter of choice. It is a gift the character of which can not be ordinarily. indulged by the recepient before accepting it. It comes to the individual unsolicited and only to socialise itself.

The artist who is ablessing to mankind defies life. He is an associate of God and feels the contact of Time and Eternity in his soul.

اس تحریر کا سیاق غالب کا کلام اورفن مصوری کا انطباق ہے۔ نیز شاعری اور پیامبری کے مقصدِ جلیل کا فکری ارتباط بھی ہے۔فن جو الہام کی علوئیت سے ہم کنار ہوتا ہے جاوداں نقش چھوڑتا ہے۔ غالب کا فن بھی دائمی اقدار سے دوام حاصل کرتا ہے۔ یہ اقدار الہامی تقدیس سے منزہ ہوتے ہیں۔ اور بنی نوع انسان کو غیر معمولی انبساط بخشتے ہیں۔ اسی انبساط پر ثقافت کا مدار قائم ہوتا ہے۔

اقبال کی مشہور تخلیق 'جاوید نامہ' اسی دور کی زندۂ جاوید یادگار ہے۔ جس میں مقاماتِ قدس کے ساتھ عظیم انسانوں کی پاکیزہ ارواح کے احوال بھی قلم بند کیے گئے ہیں۔ فلک مشتری کی سیر ارواحِ جلیلہ کی ملاقات سے شروع ہوتی ہے جس میں حلاج، اور قرۃ العین طاہرہ شامل ہیں۔ یہ خلد آشیاں اور سیر جاوداں کے مالک ہیں۔ نوائے حلاج کے بعد نوائے غالب انھیں کے مشہور اور پرسوز انقلابی آواز سے شروع ہوتی ہے۔

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگر دانیم
قضا بگردشِ رطلِ گراں بگردانیم

غالبؔ کی یہ ملکوتی آواز اقبال کو بہت پسند ہے۔ انقلاب و احتجاج کا زلزلہ خیز نعرہ ان کی اپنی آواز بن جاتی ہے۔ اس غزل کے بعد عالمِ ارواح میں اقبال و غالب کا مکالمہ شروع ہوتا ہے جو استفہام و استفسار کی صورت میں ہے۔ اقبال غالب سے خود انھیں کے شعر کا مطلب دریافت کرتے ہیں۔

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفس رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختۂ چیست؟

چھ اشعار پر مشتمل غالبؔ کا جواب نظر افروز اور توجہ طلب ہے۔ ما حصل یہ ہے۔

تو ندانی ایں مقامِ رنگ و بوست　　　قسمتِ ہر دل بقدرِ ہائے وہوست
یا برنگ آ یا بہ بیرنگی گذر　　　تا نشانے گیری از سوزِ جگر

زندہ رود کا اب دوسرا سوال ہے جس نے غالبؔ کے معتقدات کو متزلزل کیا اور نبوت کے سلسلے میں امتناعِ نظیر کے قضیے میں کھڑا کر دیا۔

صد جہان پیدا دریں نیلی فضاست
ہر جہاں را اولیاء وانبیاست

غالبؔ کا جواب ملاحظہ فرمائیے۔

نیک بنگر اندریں بود و نبود　　　پے بہ پے آید جہانہا در وجود
ہر کجا ہنگامۂ عالم بود　　　رحمۃ للعالمینؐ ہم بود

تیسرا سوال فاش تر گو زانکہ فہم نارساست
غالبؔ　ایں سخن را فاش تر گفتن خطا است
اقبالؔ　گفتگوئے اہلِ دل بے حاصل است؟
غالبؔ　نکتہ را برلب رسیدن مشکل است

زندہ رود　تو سراپا آتش از سوزِ طلب　　　بر سخن غالب نیائی اے عجب؟
غالبؔ　خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست　　　رحمۃ للعالمینؐ انتہا است
زندہ رود　من ندیدم چہرۂ معنی ہنوز　　　آتشے داری اگر مارا بسوز
غالبؔ　اے چو من بینندۂ اسرارِ شعر　　　ایں سخن افزوں تر است از نارِ شعر
شاعراں بزمش سخن آراستند　　　ایں کلیماں بے یدِ بیضا ستند
آنچہ تو از من بخواہی کافری است　　　کافری کو ماورائے شاعری است

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اقبال کی نظر میں غالب کا مقام صرف شاعر یا فن کار کا نہیں ہے۔ بلکہ ایک فکر ساز اور نکتہ رس مردِ قلندر کا ہے جس کی کارگہِ فکر میں قوموں کی تقدیر کے ماہ و انجم تخلیق پاتے ہیں۔ کیا کسی ناقد کی نظر اس بازیافت کی متحمل ہو سکی؟ یا کسی شارح نے قارئینِ غالبؔ کو یہ پرواز دی یا کسی شاعر نے پیکرِ غالبؔ میں یہ رنگ اور نقش و نگار محسوس کیا۔ تفہیمِ غالب کے لیے ایک دانائے راز کی ضرورت ہے جو فلسفہ و فکر کے ساتھ شعر و نغمہ کا رمز شناس ہو اور تخلیق کے پر اسرار اعجاز کا امین بھی ہو۔ غالب نے اشارہ کیا ہے۔

دبیرم شاعرم رندم ندیمم شیوہ ہا دارم

اب میں دورِ آخر کے کلام کی طرف آپ کا التفات چاہتا ہوں۔ یعنی بالِ جبریل، جو اقبال کے تفکر اور تخلیق کی سب سے پختہ پہچان ہے۔ کہیں کہیں سے غالب کی سایہ نشینی کی ایک جھلک پیش کرنے کی سعادت چاہتا ہوں۔ اقبال کی ایک نظم ''گدائی'' ہے۔ جو پیکر تراشی اور نغمگی کے جلو میں فکری اسالیب سے انتہائی پرکشش ہو گئی یہ۔ اس کا مصرع ملاحظہ ہو۔

اُس کے آبِ لالہ گوں کی خونِ دہقاں سے کشید

خونِ دہقاں کی ترکیب غالب کی دین ہے

برقِ خرمن راحتِ خونِ گرم دہقاں ہے

ایک اور نادر ترکیب ملاحظہ فرمائیں اقبال کا شعر ہے

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

(حافظؔ کی تلمیح دیکھیے)

دریں چمن گل خارکس نہ چید آرے
چراغِ مصطفویؐ با شرار بولہبی

ان کی شہرۂ آفاق انقلابی نظم ''فرمانِ خدا فرشتوں سے'' ہے جس کی تمثال اردو کیا ہندوستانی کیا اور عالمی ادبیات کیا؟ بہ قول مجنوں گورکھپوری مارکس اور لینن بھی ایسا انقلاب آفریں نعرہ نہ دے سکے۔ یہ شعر آپ کے حافظے میں بھی اچھی طرح محفوظ ہے۔

حق را بسجودے، صنماں را بطوافے
بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو

غالبؔ کا مشہور قول بھی آپ کی گرفت میں ہے۔

زنہار ازاں قوم مباشی کہ فروشند
حق را بسجودے و نبیؐ را بہ درودے

بسترِ علالت پر لکھی جانے والی 'ارمغانِ حجاز' کی آخری نظم سے پہلے کی نظم مولانا حسین احمد مدنی کے نظریۂ وطنیت کی تردید میں ہے نظم کا پہلا مصرع

عجم ہنوز نہ داند رموزِ دیں ورنہ

کو پیش نظر رکھیں اور غالبؔ کا یہ شعر بھی سامنے ہو تو ذہنی اشتراک اور تخلیقی اظہار کا بے مثل ارشاد خیال انگیزی کے لیے کافی ہے۔

رموزِ دیں نشناسم درست و معذورم
نہادِ من عجمی و طریق من عربی است

کیا غالبؔ کا مصرعِ ثانی اقبال کے اس زبان زد عام مصرع کی یاد نہیں دلاتا؟

نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے مری

خضرِ راہ کی ایک پسندیدہ تلمیح ہے

اے کہ نشناسی خفی را از جلی ہشیار باش
اے گرفتارِ ابوبکرؓ و علیؓ ہشیار باش

غالب سرِّ حق کے برتو گردد منجلی اے گرفتارِ ابوبکرؓ و علیؓ

اخذ و استفادے کی ان متعدد مثالوں میں اقبال کے شعری اظہار کی نوع بہ نوع کیفیات ملتی ہیں ان کی موجودگی سے نمایاں ہے کہ غالب کے اثرات کو اقبال نے کس قدر جذب کیا ہے۔ اور لاشعوری طور پر ان کے کلام میں ان کا در آنا ایک فطری تقاضا بن کر حرف وصوت میں نمایاں ہوتا ہے۔ کم سے کم اردو کے منظر نامے میں ایسی مثال موجود نہیں ہے۔ میں نے جان بوجھ کر اور آپ حضرات کو صحیح مخاطب تسلیم کر کے صرف اردو کلام سے مثالیں پیش کی ہیں جب کہ ہم آپ تسلیم کرتے ہیں کہ دونوں کے فلسفہ وشعر کا ارتکاز اردو میں نہیں فارسی میں ملتا ہے۔ فکر وفلسفہ ہو یا شعر و نغمہ ان کی ارتقاعی صورت اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ فارسی میں ہی جلوہ گر ہے یہ صرف مذاقِ سخن نہیں تھا بلکہ آفاقی ضرورت تھی اور ثقافتی تقاضا بھی۔ خوگرفتہ، ذوقِ نظر، رگِ ساز، رگِ سنگ، جادہ پیماں، جگرتاب، حسنِ ازل، جولانگہ، تاب گفتار، رمزدیں، ستیزہ کار، سراپردہ، سینہ سوز، شاہد مضمون، شب زندہ دار، شب گیر، شررفشاں، شوخیِ گفتار، عیار کامل، غوغائے رستاخیز، فروغ بادہ، فروغ نظر، کارگہ شیشہ گراں، کاسہ کرام، کافر عشق، گردش روزگار، گریبانِ مطلع، گہرہائے راز، چند چرخ کہن، لذت گفتار، شاخ نبات، مرکز پرکار، مضراب نے، محنت کش، مئے شبانہ، مئے لالہ فام، نفس آتشیں، نغمہ سنج، نوائے شوق، ولولۂ شوق، لالہ خودرو، ہمدمِ دیرینہ، ہنگامۂ عالم، جیسی بہت سی ترکیبیں مستعار و ماخوذ ہیں۔

بادی النظر میں یہ ایک سرسری ترکیب شماری ہے جن سے کلامِ اقبال کی شادابی اور شگفتگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ماضی کے فنی کمالات اور فکری یافت سے شاید ہی کوئی دوسرا فن کار اس حد تک مستفیض ہوا ہو۔ اور ان یافت کے سہارے اپنی انفرادی تخلیق کا ایسا پرشکوہ قصر تعمیر کر سکا ہو کہ تمام تخلیقات نگوں سار نظر آئیں۔ اقبال کے کلام کا جلال وجبروت اپنے قاری کو جس محویت سے دوچار کرتا ہے وہ ادبی تخلیق کا پراسرار رمز ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اقبال کی پرستش تو ہوئی مگر پیروی نہ ہوسکی۔ اقبال پر کی جانے والی سخت سے سخت معاندانہ تنقید بھی بے اثر ہوکر رہ گئی۔ کیوں کہ اقبال نے اپنے افکار کو بے پناہ جذبے کی گرمی سے ہم آمیز کیا ہے۔ اس تاب وتپش میں ہر شے پگھل جاتی ہے۔

اس باب میں آخری بات کی طرف آپ حضرات کا بہ طور خاص التفات چاہوں گا۔ اقبال کے مجموعہ ہائے کلام میں ہی نہیں بلکہ اردو ادب میں ایسی شاہ کار نظمیں میسر نہیں ہیں آپ چاہے پہلی حیثیت سے ''مسجدِ قرطبہ'' کو یاد کریں یا ''ساقی نامہ'' کو۔ اقبال کی تخلیقی جینیس اور صلاحیت کا اس سے بڑا ثبوت ہم فراہم نہیں کر سکتے۔ پروفیسر کلیم الدین احمد جیسے سخت دار وگیر رکھنے والے نقاد نے بھی ساقی نامے کو سحر آفریں نظم قرار دیا ہے۔ ساقی نامہ ظہوری سے غالبؔ تک محمد فقیہہ دردمند سے اقبال تک ساقی نامہ کی ایک ادبی روایت رہی ہے۔ غالبؔ کا ساقی نامہ اس روایت کی ایک مضبوط کڑی ہے۔ اقبال نے بھی ساقی نامے کی اسی بحر کا انتخاب کیا ہے۔ میں نفس موضوع پر گفتگو نہیں کرتا صرف شعری پیرایۂ اظہار پر آپ کی توجہ چاہوں گا۔ اقبالؔ کے ساقی نامہ کا بے مثل بہاؤ اور روانی خود شعری تخلیق کا بیش بہا سرمایہ ہے۔ اس نظم کے لفظ لفظ سے فکر یا پیغام کا چشمہ اُبل رہا ہے۔ محسوس نہیں ہوتا کہ شعر و فلسفہ میں کوئی مغائرت بھی ممکن ہے۔ ایسا امتزاج کہ خود تخلیق بھی اس بوالعجبی پر ناز کرے۔ لیکن کیا آپ کو یقین آئے گا کہ اقبال کا غالب سے استفادہ کن حدود تک لمس تحریر بخشتا ہے۔ ذرا لفظیات ملاحظہ ہوں۔

اقبالؔ کے اشعار آپ کے پیش نظر ہیں غالبؔ کے دو چار اشعار سے مقابلہ فرمائیں۔

بہ دور پیاپے بہ پیمائے مے — بشورِ دمادم بفرسائے نے

بہ می دادن اے سرد سوسن قبائے — بزلفِ درازت پیچا وپائے

چہ ساقی یکے پیکرے سیمیا　　　　مس آرزوئے مرا کیمیا
گل وبلبل وگلستاں نیز ہم　　　　مہ وانجم وآسماں نیز ہم
نواگر کنے مرغ برشاخسار　　　　بموج آدرے آب در جوئبار

حضرات یہ چند مثالیں یہاں وہاں سے برآمد کی گئی ہیں فارسی کا کلام نظرانداز کیا گیا ہے اردو کلام سے ہی سروکار رکھا گیا ہے۔اورصرف شعری پیکر اظہار تک اپنے کومحدود کیا ہے کیونکہ فکرونظر کے مشترک اور اختلافی پہلوؤں کوضبط تحریر میں لانے کے لیے ایک اور مقالے کی ضرورت ہے جن کے چار مقدماتِ گفتگو ہو سکتے ہیں۔وجوداور اعیان کا فلسفہ،عظمتِ آدم اوراس کی تسخیری قوتیں،عقل وعشق کی معرکہ آرائی، جبر واختیاروغیرہ عنوانات میں خاصے اختلافات ہیں۔ جہاں غالب اقبال کے ہم نشین نہیں ہوسکتے ہیں۔اقبال کا سروکارشعری اسالیب میں زیادہ نمایاں ہے۔دونوں کی فکری توجیہات کی راہیں بھی جداگانہ ہیں۔زمانے میں بھی مشرقین یایوں کہیے ایک صدی کا فرق ہے۔بیسویں صدی کے فکری عبقریت ماقبل کی تمام صدیوں سے ممتاز و ماوراہے۔اس لئے بھی غالب کے تفکرکواقبال کے مقابلے یاموازنے میں لانا تجزیہ کی تنگ دامانی ہی ہوگی۔آپ اسے تفہیم غالب کہیں یااقبال رسی، دراصل میں نے دونوں نابغۂ روزگارکوخراج عقیدت پیش کرنے کے لیے دونوں کی مقبولیت کو معتبر شہادت جان کر کچھ کہنے کی جرأت کی ہے۔

اقبال کی بیدلؔ شناسی

علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ ''اسلام ایک ابرِ کرم تھا جو سطحِ خاک کے ایک چپہ چپہ پر برسا۔ لیکن فیض بہ قدرِ استعداد پہنچا۔ جس خاک میں زیادہ قابلیت تھی اسی قدر فیض یاب ہوئی'' [۱]

اگر پروفیسر براؤن کے اس استعجاب کو بھی شامل کرلیا جائے تو مزید وضاحت کی ضرورت نہیں ہوگی کہ دنیا میں اس کی نظیر نہیں ملتی کہ فاتح قوم اس حد تک غالب ہو کہ مفتوح کے ادب وانشاء، زبان واسالیب اور طرزِ تحریر کو بھی تبدیل کردے۔ عرب صرف فاتح بن کر نہیں آئے۔ ایک طاقت ور ثقافتی سرمایہ کے ساتھ ایران میں داخل ہوئے جو زبان وادب میں انقلاب آفریں تخلیقی تبدیلی کا باعث بنا۔ یہی صورتِ حال ہندوستان میں بھی پیدا ہوئی۔ عربی وفارسی روایات نے نہ صرف زبان کی حد تک بلکہ ادبیات کے جوہرِ نمود کو متاثر کیا۔ اردو کی سیرابی وشادابی میں اس عظیم ادبی روایات کا جمال وجبروت آتشِ سیال کی طرح رواں دواں ہے وہی فیضان نقاشِ اول قلی قطب شاہ سے لے کر معاصر مقتدر شاعر فیض تک روحِ روانِ تخلیق ہے۔

معانی شعر تیرا ہے یا کہ شعرِ خاقانی
سنیں تو وجد کریں انوری وخاقانی

۱؎ شعر العجم جلد اول ص ۵

اردو شاعری کے بابا آدم ولی نے خراج پیش کرتے ہوئے اس فارسی استفادہ واستناد کو تخلیقی تنوع بخشا ہے۔ یہی نہیں محبوب کے حسن و جمال کی سراپا نگاری میں فارسی فن کاروں کی شبیہہ سازی کی جو تمثیل پیش کی ہے وہ اقرار واعتراف میں اردو کیا فارسی میں بھی بہت مشکل سے ملے گی۔

ترا مکھ مشرقی، حسن انوری، جلوہ جمالی ہے
نین جامی، جبیں فردوسی وابرو ہلالی ہے

اس روایت کا تسلسل اور تنوع ہمہ گیر بن کر ایک میزان فراہم کرنے کا موجب قرار پاتا ہے۔ پورے اردو ادب پر نظر ڈالئے تو یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ شعری عظمت کے وہی مستحق تسلیم کئے گئے جنھوں نے فارسی ادبیات کے چراغ سے اپنے نہاں خانۂ تخلیق کو روشن کیا ہے خواہ وہ غالب ہوں یا اقبال۔ مستقبل میں بھی یہی معیار ومنہاج آواز دیتا رہے گا۔ ان دونوں فن کاروں نے صرف استفادہ واستخراج ہی نہیں کیا ہے بلکہ دونوں ذولسان شاعر ہیں۔ اور دونوں اس لازوال سرمایہ کی دریابی کے لئے اپنی ممنونیت کو کشادگی قلب ونظر کے ساتھ پیش کرتے رہے ہیں۔ غالب کے صرف ایک اعتراف پر اکتفا کرتا ہوں۔

بہ نظم ونثرِ مولانا ظہوری زندہ ام غالبؔ
رگِ جاں کردہ ام شیرازہ اوراقِ کتابش را

علامہ شبلی کا اعلان بھی قابلِ توجہ ہے:

گر خداوندی ہوس داری در اقلیمِ سخن
بندگی حافظِ شیراز می بایست کرد

اقبال کا معاملہ ان سب سے مختلف اور معنی خیز ہے۔ انھوں نے تو فکر وفن کی تمام طرفگی وتابندگی کو مولانا روم سے منسوب کرکے جس نیازمندی کا اقرار کیا ہے وہ مطالعۂ رومی میں سب سے منفرد ہے۔

پیرِ رومی خاکِ ما اکسیر کرد   از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد

تلمیذِ رومی کے اعتراف سے اقبال کو فائدہ پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو مگر اقبال نے رومی

شناسی کی ایک محکم اساس فراہم کی۔ ناچیز کا خیال ہے کہ اقبال نے نظیری نیشاپوری کو جو عقیدت پیش کی ہے وہ شاید اپنی مثال آپ ہے۔ نظیری کو بھی ایسا نذرانہ کسی اور قلم کار سے نصیب نہ ہوسکا۔

بملکِ جم ند ہم مصرعِ نظیری را
کسے کہ کشتہ نشد از قبیلۂ ما نیست

اقبال کے فکری اسالیب واظہار میں نظیری کے فیضان کی باز آفرینی ایک سنجیدہ مطالعہ کا تقاضا کرتی ہے۔ ڈائری سے لے کر خطوط اور شعری تخلیقات میں تواتر اور دلکشی کے ساتھ بار بار نظیری کا تذکرہ حیرت سے خالی نہیں ہے۔ صرف ایک دوسری اور بے حد اہم مثال ملاحظہ فرمائیں۔ ''اسرارِ خودی'' اقبال کے فکر ونظر کی دستور ساز تخلیقی دستاویز ہے یہ شعری منشور سرنامۂ کتاب کے طور پر نظیری کے ہی شعر سے مزین ہے۔

نیست درخشک وترِ بیشۂ من کوتاہی
چوبِ ہر نخل کہ منبر نشود دار کنم

یہ قول مولانا گرامی ملا نظیری نے اقبال کو ہی اپنا جانشین منتخب کیا ہے۔ اقبال کے یہاں رومی ونظیری کی تحدید نہیں پچاسوں شعرائے فارسی کے حوالے ہیں۔

آپ واقف ہیں کہ اقبال کے فلسفہ وشعر کے سرچشموں کی بازیافت کے لئے ان گنت آثار وعلائم پر نظر درکار ہے۔ کیونکہ ادبیات میں اقبال نے استفہام واستنباط کا جو تنوع اور تکثیر پیش کی ہے وہ کہیں نہیں ملے گا۔ تقریباً تیرہ سو سے زائد اشخاص واشاروں کا حوالہ صرف شاعری میں موجود ہے۔ نثری تحریروں کو شامل کریں تو یہ شمار ہزاروں میں ہوگا۔ اس ایک نکتے سے اقبال کی عظمت وآفاقیت اور ان کے مطالعہ کی بیکراں کیفیات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔

ان کی تحریروں میں مرزا بیدل کے بیسوں حوالے درآئے ہیں۔ جو شعوری بھی ہیں اور فکر وتعمل سے معمور بھی۔ ذرا آپ اس تذکرے کے تسلسل پر نظر ڈالیں تو ہر دور کی فکری وشعری کاوشوں میں مرزا بیدل کا تذکرہ ناگزیر حیثیت کا حامل نظر آئے گا۔

نظم نالۂ فراق ۱۹۰۴ء میں مخزن میں شائع ہوئی ہے نظم 'بانگِ درا' کے ابتدائی حصے میں موجود ہے۔ یہ ۲۴ اشعار کی نظم ہے۔ مگر بانگِ درا کی ترتیب کے وقت نو اشعار حذف کردیئے گئے۔ جواب باقیات میں محفوظ کردیے گئے ہیں۔ اس نظم کا اختتام مرزا بیدل کے اس شعر پر ہوتا ہے۔

زندگانی در جگر خاراست وورپا سوزن است
تا نفس باقیست در پیراہنِ ماسوزن است

یہ ابتدائی نقش ہے اور کسی قدر معنی خیز ہے۔ فکرِ اقبال کی تشکیل میں یہ خیال بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اقبال کے فکری سفر کے ارتقا میں ان خیالات کی بڑی معنویت ہے۔ اقبال نے ایک جگہ لکھا ہے۔

"دنیا میں چار اشخاص ایسے ہیں کہ جو بھی ان کے طلسم میں گرفتار ہوجاتا ہے مشکل سے رہائی پاتا ہے اور وہ چاروں ہیں ابن عربی، شنکر آچاریہ، بیدل اور ہیگل"۔

شذراتِ فکر اقبال کا پہلا مجموعہ ان کی ڈائری ہے۔ جو ۱۹۱۱ء کے قریب لکھی گئی۔ اس میں بیدل کا تذکرہ ایک جہانِ معنی رکھتا ہے۔

Wonder, says Plalo is the mother of all Sciences. Bedil looks at the emotion of wonder from a different stand point. Says.

نزاکت ہاست در آغوش مینا خانۂ حیرت
مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگِ تماشا را

To Plato wonder is valuable because it leads to our questioning of nature to Bedil, it has a value of its own. Irrespective of its intellectual consequences. It is impossible to express the idea more beautifully than Bedil (Stray Reflection 86.)

اس ڈائری میں مرزا بیدل سے استفادے کا اقرار بھی موجود ہے۔ جو اقبال کی فکری تفہیم میں بہت معاون ہے۔

Hegal, Goethe, Ghalib, Bedil and Wordswdrth I confess and owe a great deal to Hegal Goethe, Mirza Ghalib, Mirza Adbul Qadir Bedil and Wordsworth. The first two led me into the "inside" of the things. the third and fourth taught me how to remain oriental in spirit and expression after having assimilated foreign ideals of poetry, and the last saved from atheism in my student days.

"مجھے اعتراف ہے کہ میں نے ان کے فیضان نظر سے بہت کچھ اخذ کیا ہے"۔

خواجہ حسن نظامی کے نام غالباً ۱۹۱۲ء کے۔ خط کے آخر میں بیدل کا شعر درج ہے۔

''بکلامِ بیدلؔ اگر رسی مگور زجادۂ منصفی

کہ کسے نمی طلبد زتو حوصلۂ دگر مگر آفریں''

(کلامِ بیدل اگر تمہیں ملے تو انصاف کے راستے سے نہ ہٹنا کیوں کہ کوئی تم سے واہ واہ کے سوا کچھ صلہ طلب نہیں کرتا)۔

مہاراجہ کشن پرشاد کے نام اپریل ۱۹۱۷ء کے خط میں یہ مصرع بھی بڑی دل کشی کے ساتھ نقل کیا گیا ہے۔

اگر نزدیک وگر دورم غبارِ آں سرِ کویم

سید سلیمان ندوی کے نام ۱۹۱۸ء کے خط میں شعری استناد کے طور پر ذکر ملتا ہے۔ قوتِ واہمہ کے عمل کی رو سے بیدل اور غنی کا طریق زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ گو کتبِ بلاغت کے خلاف ہے۔

تا نوائے یک اذاں بالیدہ است

تا چند بالد نفس اندود نوائم (بیدلؔ)

شاعری اور شذرات کے علاوہ خطوط کی چند عبارتیں بھی غور طلب ہیں۔

پروفیسر ضیا احمد بدایونی کے نام ۹ رنومبر ۱۹۳۴ء کا خط ہے۔ جسے 'دیوانِ مومن'' کی حصول یابی پر لکھا تھا یہ بہت اہم خط ہے جو کہ اقبال کے ادبی نصب العین اور فن کے تفکیری

پہلوؤں پر ایک بے باک تبصرہ ہے۔

’’نفسیاتی اعتبار سے دیکھا جائے تو ان کے اندازِ بیان میں وضاحت کی کمی ہندستانی مسلمانوں کے انحطاط پذیر جذبۂ حکمرانی کا ایک اہم لیکن اذیت ناک ثبوت بھی ہے۔ صرف حاکم قوم میں اظہار کی وضاحت ایک لازمی امر ہے۔ یہ کیفیت یعنی وضاحت کی کمی مومن کے یہاں اس قدر عام ہے۔ کسی قدر کمی کے ساتھ مومن سے کہیں زیادہ عمیق ذہنوں میں بھی نظر آتی ہے۔ (جیسے غالب اور بیدل) اس مریض قوتِ ارادی کی دوسری علامات یا نتائج میں قنوطیت اور تصوف بھی شامل ہیں۔ جس میں ابہام سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور تشنہ بیانی کو گہرائی سمجھ کر مزہ لیتے ہیں‘‘ [۱]

بیدل بہ قول علامہ ایک عمیق ذہن رکھنے والے نابغۂ روزگار تھے اور متصوفانہ فکری عبقریت رکھتے تھے۔ اظہار میں ابہام تشنہ بیانی اور غیر وضاحتی اسالیب بیان کے مالک تھے۔ بیدل کے دقائق کی یہ تعبیر معنویت کی حامل ہے۔ ہم واقف ہیں کہ بیدل ایک عمیق فکر رکھتے تھے۔ جو مابعد الطبیعاتی احوال و مقام کی اسرار کشائی سے دوچار ہے۔ فکری تعمق اور تموج کی ایسی مثال شاید ہی کہیں نظر آئے۔ وہ ایک غیر معمولی شاعر ہیں۔ اور شاعری میں فکر کی ارتفاعیت کے نقیب ہیں۔ اس کا متحمل ہونا آسان نہیں اور پیروی بھی مشکل ہے۔ چنانچہ تفہیمِ بیدل کی پایابی ہنوز دشوار طلب ہے۔ شرح و بیان کی ضرورت باقی ہے۔ اقبال نے بیدل کے افکار کی تعبیر کی ایک کوشش کی تھی۔ انگریزی میں چند ورق قلم بند کئے تھے۔ جو ناتمام رہا۔ جسے بعد ازاں ڈاکٹر تحسین فراقی نے اردو ترجمے کے ساتھ شائع کیا ہے۔ بہت ہی مختصر سہی مگر یہ بیدل شناسی میں ناگزیر اہمیت رکھتا ہے۔ غالب جیسا بے عدیل فن کار بھی طرزِ بیدل کی تقلید کو قیامت کی سی آزمائش کہہ کر راہِ فرار اختیار کرنے پر اپنے کو مجبور پاتا ہے۔ اسی خط میں ہے کہ

’’آپ کا ارشاد تھا کہ صبح کے لئے آفتاب کی کیا ضرورت ہے مزید ترکیب مرزا بیدل کی میں نے اس کے لئے محلِ استعمال نیا پیدا کیا ہے‘‘۔

---

[۱] کلیاتِ مکاتیب جلد سوم ص ۶۶۴

یہ شواہد بتا رہے ہیں کہ اقبال کو فلسفیانہ اظہار کے لئے جن شعری اسالیب کی ضرورت تھی۔ بیدل رہ نمائی کر سکتے تھے۔ مزید یہ کہ اقبال کو بیدل کے کلام سے ایک گونہ قربت ہے۔ کیوں کہ سبکِ بیدل سے بہتر فلسفہ وشعر کے ارتباط کی صورتیں کم یاب ہیں۔ اقبال کی عظمت کی تمام تر اساس اسی حسنِ امتزاج پر موقوف ہے۔ فکر کو جذبہ واحساس کی درون بینی سے ہم آمیز کرنے کے لئے بیدل سے رجوع کرنا ایک تخلیقی ضرورت ہے۔ اقبال کی تراکیب اور اظہار کے اسالیب پر بیدل کے عکس وآہنگ کی تفصیلات پیش کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ اگر چہ یہ ایک مفید مطالعہ کا عنوان ہے۔ راقم کا خیال ہے کہ بیسویں صدی کے برصغیر میں رومی کے ساتھ بیدل شناسی اقبال کی مرہونِ مطالعہ ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اسے تسلیم کرنے میں کسی کو تامل ہو مگر یہ حقیقت ہے کہ اس مطالعہ میں وہ ایک رکن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حیرت ہے کہ عہدِ اقبال کی معاصر اور مقتدر کتاب شعرالعجم بیدل کے تذکرے سے خالی ہے۔

''بانگِ درا'' کے تیسرے حصے میں یعنی ۱۹۲۴ء سے قبل مذہب کے عنوان سے ایک نظم ہے۔ جس کا ذیلی عنوان ہے۔ تضمین برشعر مرزا بیدل۔ سچ پوچھئے تو مرزا کے شعر کو سامنے رکھ کر ہی پوری نظم کہی گئی ہے۔ اس نظم کے آخری شعر میں تو اقبال نے خیالات کے مستعار ہونے کا ہی نہیں مرشد کامل کہہ کر بیدل کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے۔ مغربی افکار اور مذہب کی کشاکش کے درمیان جادۂ راہ اور سلامتیٔ فکر ونظر کے لئے مرزا بیدل کی پیروی لازمی ہے۔

کہتا مگر ہے فلسفۂ زندگی کچھ اور
مجھ پر کیا یہ مرشدِ کامل نے راز فاش
''با ہر کمال اند کے آشفتگی خوش است
ہر چند عقلِ کل شدۂ بے جنوں مباش''

خرد اور جنوں یا عقل وعشق اقبال کے مطالعہ میں ایک مستقبل موضوع ہے۔ عقل کی نارسائی وعشق کی کارفرمائی اور کشاکش پر کثرت سے اظہار ملتا ہے۔ اقبال بینش و دانش کے مقابل قلب ونظر کو ترجیح دیتے ہیں۔ مگر ایسا نہیں کہ وہ عقل کے ارتعاشات سے انکار کرتے

ہوں۔ وہ دونوں کے امتزاج وارتباط پر نظر رکھتے ہیں ان کے نزدیک روحانی راز جوئی ہو یا
مادی فتح مندی دونوں کی ہم آہنگی ملزوم حیثیت رکھتی ہے۔

زیر کی از عشق گردد حق شناس
کارِ عشق از زیر کی محکم اساس

عشق چوں بازیر کی ہم برشود
نقش بندِ عالم دیگر شود

''ضربِ کلیم'' پایانِ عمر کا حاصل ہے۔ اس میں ''مرزا بیدل'' کے عنوان سے چار اشعار کی ایک مختصر نظم موجود ہے۔ وجود وعدم یا بود ونبود کے تصورات نے انسانی فکر کو تشکیک کے تلاطم میں اس طرح مبتلا کیا ہے کہ انکار وانحراف کی عمومی فکر پیدا ہوگئی ہے۔ اقبال نے ادعائیت کے ساتھ اعلان کیا ہے کہ پر اسرار حقیقت کی آگہی یا عرفان کے لئے بیدل کے تصورات سے رہ نمائی حاصل ہوسکتی ہے۔

ہے حقیقت یا مری چشمِ غلط بیں کا فساد
یہ زمیں یہ دشت یہ کسار یہ چرخِ کبود

کوئی کہتا ہے نہیں ہے کوئی کہتا ہے کہ ہے
کیا خبر ہے یا نہیں ہے تیری دنیا کا وجود

میرزا بیدل نے جس خوبی سے کھولی یہ گرہ
اہلِ حکمت پر بہت مشکل رہی جس کی کشود

''دل اگر می داشت وسعت بے نشاں بود ایں چمن
رنگِ مے بیروں نشست از بسکہ مینا تنگ بود''

گویا فلسفیانہ مباحث یا موشگافیوں کی کشود وکلید مرزا بیدل کے افکار واشعار میں موجود ہیں۔ ان کے کلام کی معنویت پر علامہ کے یہ تاثرات ایک فلسفی شاعر کے خراج ہیں جو بیسویں صدی کے ساتھ مشرقی ومغربی افکار وآراء کا خود منبع ومصدر ہے۔ اقبال لینن کی زبان سے یہ کہلوا چکے ہیں کہ

میں کیسے سمجھتا کہ تو ہے یا کہ نہیں ہے
ہر دم متغیر تھے خرد کے نظریات

عصرِ حاضر کی فکر بے بصیرت رہی ہے کہ وہ انحراف وانکار یا تشکیک وتذبذب میں مبتلا کرنے کا موثر وسیلہ بنی۔ اشیائے کائنات کے ادراک اور حقیقتِ اولیٰ کے عرفان میں کلامِ بیدل کی رہ نمایانہ فکر سے رجوع کرنے کی ضرورت پر اقبال کے موثرات بڑے ہی معنی آفریں ہیں۔

اقبال کے ان خیال افروز حوالوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بیدل کے بارے میں بعض کم فہمی کی بنا پر قائم کردہ بیانات کی حقیقت کچھ بھی نہیں۔ ان کے فکری رویوں کی باز کاری کے لئے سنجیدگی کے ساتھ متوجہ ہونے کی ضرورت ہے کیونکہ بیدل صرف فارسی یا برصغیر کے شاعر ہی نہ تھے۔ مشرقی ادبیات میں فکری شاعری کے علم بردار بھی تھے۔ وہ افکار جو ان کے عہد کے نمایاں مباحث کی حیثیت رکھتے تھے۔ خاص طور پر مابعد الطبیعاتی فکر اور کائنات کا الٰہیاتی نظام، وجود وموجود، ذات وصفات کے دقیق معاملات درپیش تھے۔ علامی عبدالحکیم سیال کوٹی بھی اس مہم جوئی میں پیش پیش تھے۔ بیدل اپنے تخلیقی ذہن سے غور وفکر میں مشغول تھے۔ ان مہمات مسائل میں وحدت وکثرت نے ہر ذہن کو متاثر کیا تھا۔ صوفیانہ تصورات کے برگ وبار کو بھی شہودی اجتہادات نے وجودی عقائد کو مشتبہ ومشکوک بنادیا تھا ان فکری آویزشوں سے اہلِ دانش دامن کشاں نہیں ہوسکتے تھے۔ بیدل کے فکر ونظر میں یہ مسائل تھے۔ وہ خود صوفی منش اور تصوف کے ہم مشرب وہم راز تھے۔ انہوں نے ''چہار عنصر'' میں اپنے ذہنی سفر اور اس کی کیفیات کا احوال درج کیا ہے۔ بعض بزرگوں سے انھیں عقیدت تھی۔ خاص طور پر شاہ ملوک جنھیں وجودی عقیدے سے بڑی انسیت تھی۔ شیخ قادری شاہ فاضل شاہ کابلی جیسے بزرگوں سے بھی بیدل متاثر تھے۔ مگر وہ مروجہ تصوف اور مریضانہ مجادری کو ناپسند کرتے تھے۔

در مزاجِ خلق بے کاری ہوس می پرورد
غافلاں نامِ فضولِ را تصوف کردہ اند

اقبال نے رسمی تصوف اور اس کی گمرہی پر جس تشدد سے تنقید کی ہے وہ شاید ہی کہیں ملے۔

محرومی ومحکومی ونومیدئ جاوید
جس کا یہ تصوف ہو وہ اسلام کر ایجاد
تصوف، تکلم، شریعت کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام

بیدل نے وحدت کے مضمون کو شعری تلازموں کے ساتھ ان گنت روپ دیئے ہیں۔ کہیں

عالم ہمہ یک جلوۂ ذاتِ وحداست
ایں جانہ ہیولی نہ صورت نہ جداست
کثرتِ آثارِ چشم وا کردن است
ایں صفر چو محو شُد ہماں یک عدد است

یا

پیشتر ز آشوبِ کثرت وحدتے ہم بودہ است
یاد آں موجے کہ در بیرونِ ایں دریا زدیم

اقبال کی ابتدائی فکر اسی وجودی تفکیر کے تابع ہے۔ جس میں

وحدت میں ہو گیا ہے کثرت کا راز مخفی

کا نظریہ بڑی آب وتاب کے ساتھ ملتا ہے۔ مگر حقیقتِ حال کے انکشاف نے اقبال کو انحراف کے لئے مجبور کیا۔ پھر بھی وہ بیدل سے دست بردار نہ ہو سکے اور ان تصورات میں دل کشی محسوس کی جن میں بیدل نے شعورِ خویشتن کے ادراک پر زور دیا ہے۔

یکے ہمچو خم در گریبانِ خویش نظر کن ببیں جوشِ طوفانِ خویش
زشورِ تو ایں بزم دارد خروش
طلسمِ جہاں پردۂ سازِ تست تہی از خود و پرزِ آوازِ تست

ان بنیادی خیالات کو ذہن میں رکھیے تو اقبال کی اساسی فکر کے مقدمات قائم کرنے

میں سہولت ہوگی۔ اپنے وجود کی عظمت ورفعت کا عرفان ہی خودی کا حاصل ہے۔ جس پر اقبال کے فلسفہ وفکر کی پرشکوہ عمارت کھڑی ہے۔ اسرار کے ابتدائی اشعار یعنی پانچویں شعر سے پیغام شروع ہوتا ہے۔

ذرہ ام مہر منیرانِ من است — صد سحر اندر گریبانِ من است
خاکِ من روشن تراز جام جم است — محرم از نا زاد ہائے عالم است
برقہا خوابیدہ درجانِ من است — کوہ وصحرا بابِ جولانِ من است
صد جہاں پوشیدہ اندر ذاتِ او — غیر او پیداست از اثبات او
وسعتِ ایام جولا نگاہِ او — آسماں موجِ زگردِ راہِ او

خودی کے مختلف تلازمے ہیں۔ مگر ان میں بہت اہم اور سب سے موثر عنصر تحرک وتفاعل ہے۔ جسے سعی پیہم اور عملِ مسلسل کہتے ہیں۔ اسی سے خودی لافانی اور لازوال بنتی ہے۔ نوعِ بشر یا معاشرۂ انسانی اس کے حصول کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ یہی حرکت وعمل جو تسخیرِ کائنات کے ساتھ رہِ حیات کو نورونار میں تبدیل کرتا ہے۔

درعمل پوشیدہ اسرارِ حیات

مرزا بیدل کے کلام میں اسی جذبۂ تفاعل کو بھرپور بصیرت کے ساتھ بارہا پیش کیا گیا ہے۔ جس سے ان کے فکری متعلقات کی نشان دہی ہوتی ہے۔

موجِ دریا را بہ ساحل ہم نشینی مشکل است
بے قراراں نذرِ منزل کردہ اند آرام را

یا

کوشش فرہاد آخر کرد شیریں سنگ را

یا

جرأتِ پرواز برقِ خرمنِ آسودگیست

اقبال کے ساقی نامہ کا یہ نکتہ پیش نظر رکھیے۔ فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

یا

اے مسافر جان بمیرد از قیام
زندہ تر گردد ز پروازِ مدام

اسی نقطۂ نظر سے نا قابلِ تسخیر عزائم اور بلند ارادوں کی پرورش ہوتی ہے۔ منفی اور مایوسی کا مداوا بھی اسی سے ممکن ہے۔ فکرِ بیدل کی اس رجائیت کا انکار کرنا اقبال کے بس میں نہ تھا بلکہ ان کے شعور میں پیوستہ ہو چکا تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ اقبال اپنے فکری تشکیل میں مختلف بلکہ متضاد سرچشموں سے اکتساب کرنے سے بھی اجتناب نہیں کرتے یہی وجہ ہے کہ مارکس و مسولینی سے عقیدت بعض وقت گراں گزرتی ہے۔ مگر اقبال ان شخصیات کے ان بعض جزوی پہلوں پر نگاہ رکھتے ہیں۔ جن سے ان کے افکار کو تقویت ملتی ہے۔ یہی بات بیدل کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے کہ بیدل کے بعض تصورات سے اقبال کو سروکار نہ ہونے کے باوجود کچھ پہلوؤں سے ان کی والہانہ وابستگی ہے۔ یہاں بیدل کے شعری موثرات کو دانستہ طور پر نظر انداز کیا گیا ہے۔ تاکہ آپ پر گراں نہ ہو اسی لئے اس جائزہ کو محدود رکھا گیا ہے۔

ستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو سمن درا
تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ درِ دل کشا بہ چمن درا

اقبال اور تصوف

تصوف دنیاے دانش کا دلچسپ موضوعِ سخن ہے مگر اسے مقبولیت کے مدارتک بلندی بخشنے میں شعری تخلیقات نے سب سے زیادہ مدد کی ہے۔ اسے تلازمۂ شعر کے لیے ضروری گردانا گیا۔ اور شعر گوئی کے لیے بہت پسند کیا گیا۔ جس کے نتیجے میں ذکر وفکر سے دور کا بھی تعلق نہ رکھنے والے فن کاروں نے اسے خوب برتا۔ شعری اظہار میں رمز وایما کے ساتھ ابہام وایہام کو اساسی حیثیت حاصل ہے۔ برہنہ گفتاریِ گویائی کی منہاج نہیں ہے۔ انسانی ذہن کی کج ادائی تخلیقی میں شاید سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔ تحریر میں متعین مفاہیم کے ساتھ دوسرے تصورات کا جہانِ معنی پنہاں ہوتا ہے۔ جو قاری کے بہ قدرِ ظرف ہاتھ آتا ہے۔ حقیقت سے مجاز اور مجاز میں حقیقت کی تصویر فروزاں ہوتی ہے۔ تصوف کی اس تعلیم میں بڑی دل کشی تھی۔ اقبال جیسا مفکر شاعر بھی مدتوں اس کے دامنِ سحر سے دست بردار نہ ہوسکا۔ وہ عام وجودی کی طرح ان تصورات کے حصار میں گرفتہ رہے۔

حسن ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے
انساں میں وہ سخن ہے غنچہ میں وہ چٹک ہے
کثرت میں ہ وگیا ہے وحدت کا راز مخفی
جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے (جگنو)

ان تاثرات کے اسباب کی نشان دہی یہاں بے محل ہے۔ دانشِ فرنگ کے مطالعہ نے اقبال کے وجودی تصورات میں تبدیلی پیدا کی۔ جو بعد ازاں احتجاج اور بیزاری میں بدل گئی۔ یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ مخالفت میں وہ شدت پیدا ہوئی جس کی تمثیل امام ابن تیمیہ اور حضرت مجدد کے بعد مشکل سے ہی ملے گی۔

یہ ذکرِ نیم شبی یہ مراقبے یہ سرور
تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں
مسکینی و محکومی و نومیدیٔ جاوید
جس کا یہ تصوف ہو وہ اسلام کر ایجاد
مجاہدانہ حرارت نہ رہی صوفی میں
بہانہ بے عملی کا بنی شرابِ الست

(ہندی اسلام)

وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد
محبت میں یکتا حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا
یہ سالک مقامات میں کھو گیا

(ساقی نامہ)

شروع کے دونوں اشعار "ضربِ کلیم" کے ہیں جو آخری دور کا کلام ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اقبال آخری دور میں تصوف سے قریب ہوگئے تھے۔ آپ کے استصواب کے لئے یہ اشعار پیش کئے گئے ہیں۔ یورپ میں تحقیقی مقالے کی تیاری میں کئی ایسے مقام بھی آئے جنھوں نے حقیقت شناسی کی نظر بخشی۔ فکرِ اقبال کے دو عناصر ایسے ہیں جو وارفتگی کی حد تک اقبال کو عزیز تھے مگر اس مختصر قیام نے ان سے نفرت پیدا کردی کہ وہ پایانِ عمر تک ان کی مخالفت کرتے رہے اور ان کے ساتھ ہر طرح کی مفاہمت سے گریز کیا۔ جغرافیائی نظریۂ قومیت اور وجودیت کی تنقیص میں شاید ہی کوئی دوسرا اقبال کا حریف بن سکے۔

کسی بھی حرکی نظریۂ حیات کے مبلغ کے لئے صوفیانہ قیل وقال قابل قبول نہیں ہوسکتے۔ وحدت وکثرت یا وجود موجود کے دل فریب تصورات نے تفکیر وتوہم کی ایک دنیا آباد کی ہے۔ جن سے شریعت گریباں گیر رہی ہے یہی وجہ ہے کہ علمائے شریعت نے ہر دور میں ان کی ضرر رسانی سے معاشرہ کو محفوظ رکھنے کی تاکید کی ہے۔ اقبال کے نزدیک اسلام میں یہ اجنبی پودا ہے جس نے یونانی عجمی اور ہندی تصورات کے بطن سے جنم لیا ہے اور قوائے عمل کو شل کیا ہے۔ اقبال نے کم سے کم دس خطوں میں ان نظریات کی مخالفت کی ہے۔ جن کے مندرجات کا ماحصل یہ کہ تصوف یونان وعجم اور ہند کا زائیدہ ہے، یہ اسلام سے مغائرت رکھتا ہے۔ ایرانی شعرا نے طرح طرح سے بیان کرکے اسے مقبول بنایا۔ یہ تمام تر دور انحطاط کی مرہون منت ہے مذہب کا مقصد عمل ہے۔ ترکِ عمل نہیں۔ اسلام کے روشن ترین تصورِ توحید کے بعد ہمہ اوست کی ضرورت نہیں ہے۔ اقبال کے مضامین بھی بری معنویت رکھتے ہیں۔ جو وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ اور پھر ان کی ناتمام کتاب ''تاریخِ تصوف'' جسے ڈاکٹر صابر کلوردی نے مرتب کرکے شائع کیا ہے۔ انھیں خیالات کی حامل ہے۔ ان کے علاوہ اشعار میں جگہ جگہ ان مباحث پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ اولین شعری مجموعہ ''اسرارِ خودی'' میں اقبال نے خواجہ حافظ کے حوالے سے تصوف پر تنقید شروع کی۔

ہوشیار از حافظِ صہبا گسار — جامش از زہر اجل سرمایہ دار
نغمۂ چنگش دلیلِ انحطاط — ہاتِف او جبرئیلِ انحطاط
بے نیاز از محفلِ حافظ گذر — الحذر از گوسفنداں الحذر

اس کے بعد

مذہب اول فلاطونِ حکیم — گوسفندِ در لباسِ آدم است
از گروہِ گوسفندانِ قدیم — حکمِ او بر جانِ صوفی محکم است

گوسفندی کا بنیاد گزار فلاطون ہے۔ جس نے عینیت (سکونی تصوریت) کی بنیاد رکھی۔ اس نے عالم امکانِ سے الگ ایک عالم اعیان تخلیق کی اور عالم امکان کے برعکس عالم اعیان کی وکالت کی۔ جس کی رو سے یہ مادی کائنات اور اس کی ہر شے بعینہٖ علمِ خداوندی

میں ہے۔ جسے صورِ مجردۂ علمیہ کہتے ہیں۔ وہی صورِ علمیہ یعنی اعیان اس عالم آب وگلِ میں محسوسات اور مادے کی صورتوں میں دعوت نظارہ دے رہے ہیں۔ یہ اصل نہیں بلکہ عکس ہیں۔ گمانِ حقیقت کی مظہر اور نظر فریب ہیں فنا پذیری ان کا مقدر ہے۔ یہ ابدیت سے محروم نقش ناتمام ہیں۔ اور صورِ علمیہ کے سبب شہود میں آئے ہیں گویا استقرار سے عاری ہیں۔ غرض یہ وہ مباحث ہیں جن سے صوفیا اور شعرا نے بڑی موشگافیاں پیدا کیں۔ اقبال خودی کے علم بردار تھے جس کی اساس اثبات واسقرارِ ذات کے ساتھ جہد وعمل پر قائم ہے۔ اپنے وجود کے ساتھ عالمِ موجودات کے مناظر ومظاہر کے استحضار کا یقین واعتماد ہی خودی کے استحکام کا ضامن ہے۔ یہ حقیقت ہے اور وہم وگماں سے ماورا ہر ذرۂ کائنات کی طرح تارِ نفس بھی ہر لحہ آگہی کا احساس دلاتا ہے۔

من از بود ونبود وخود خموشم　　اگر گویم کہ ہستم خود پرستم
ولیکن اس نوائے سادہ کیست　　کسے در سینہ می گوید کہ ہستم

اسرار کے ابتدائی اشعار اور پیش گفتار کے مندرجات کی اشاعت پر بعض نام نہاد اور کم نظری کے شکار متصوفین اقبال کے خلاف صف آرا ہوگئے۔ مسائل کی موشگافیوں نے بری مکروہ صورت اختیار کی۔ اقبال بھی مطالعہ وفکر کی پوری تاب کاری کے ساتھ میدان میں اترے اور اپنے موقف ومعروضات کی دِفاع میں فروگذاشت کا کوئی موقع فراہم نہ ہونے دیا۔ مولانا اسلم جیراج پوری کے نام خط کی ایک عبارت ملاحظہ ہو:

> ''تصوف سے اگر اخلاص فی العمل مراد ہے (اور یہی مفہوم قرونِ اولیٰ میں اس کا لیا جاتا تھا) تو کسی مسلمان کو اس پر اعتراض نہیں ہوسکتا۔ ہاں جب تصوف فلسفہ بننے کی کوشش کرتا ہے اور عجمی اثرات کی وجہ سے نظامِ عالم کے حقایق اور باری تعالیٰ کی ذات سے متعلق موشگافیاں کرکے کشفی نظریہ پیش کرتا ہے تو میری روح اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے''۔

نیاز الدین خاں کے نام خط کی مختصر عبارت ملاحظہ ہو:

"تصوف کے ادبیات کا وہ حصہ جو اخلاق وعمل سے تعلق رکھتا ہے نہایت قابل قدر ہے۔ کیوں کہ اس کے پڑھنے سے طبیعت پر سوز وگداز کی حالت طاری ہوتی ہے فلسفہ کا حصہ محض بے کار ہے اور بعض صورت میں میرے خیال میں قرآن کے مخالف۔ اس فلسفہ نے متاخرین صوفیہ کی توجہ صور واشکالِ غیبی کے مشاہدہ کی طرف کردی"۔

اقبال اپنے معروضات کو کتابی شکل میں بہ صراحت بیان کرنا چاہتے تھے جو نہ ہوسکا۔ تاریخ تصوف لکھنی شروع کی تھی کچھ ابواب مکمل ہوگئے تھے۔ مگر کتاب کی تکمیل نہ ہوسکی۔ اس میں "تصوف اور اسلام" کے بارے میں کچھ حوالے بھی موجود ہیں۔ خاص طور پر موازنے کے نوٹس خاصی اہمیت رکھتے ہیں جس میں اسلام کے اقوال اور صوفیا کے اقوال میں تصاد وتخالف ہے بابِ تصوف اور شاعری سے متعلق فارسی کے ۳۴ اشعار محفوظ کیے گئے ہیں۔ جن میں شعائرِ اسلام کی تردید وتنسیخ کا پہلو غالب ہے۔ اس سے اقبال کے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ عجمی شاعری نے مسلم معاشرے میں مکروہ تصورات کو دبے پاؤں داخل کیا۔ جس نے نظریۂ حیات کو نقصان پہنچایا ایرانی ذہن کی ثنویت یہاں بھی رنگ لائی۔

اقبال کے نزدیک تشریعی قوانین بنی نوع انسان کی فلاح وفروغ کے لئے کافی ہیں۔ یہی تکوینی نظام کا منشا بھی ہے۔ پیغمبروں کی بعثت کا مقصود بھی فطرت کے مقاصد کی نگہبانی ہی ہے۔ خیرِ کثیر کا حصول اور ان کی برکتوں سے بہرمندی تمام کوششوں کا حاصل ہے۔ اس نظام کے ضابطے متعین اور مشاہدات نظر کے سامنے ہیں۔ جن پر عمل پیرا ہوکر دنیوی اور اخروی زندگی کو نصرت حاصل ہوتی ہے۔ ان تشریعی یا تکوینی نظام میں باطنی مفہوم کی تلاش ایک متوازی فکر کو جنم دیتی ہے اور تاویلات کا پرفریب باب کھولتا ہے۔ جس میں ذہنی ریاضت اور دور از کار مباحث کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ متعین مشاہدات کو غیر حقیقی سمجھنا اور ان کے اندرون میں پوشیدہ تاویلات کے دفترِ بے معنی کو سچ گردانا ایک گریز اور فرار ہے جس کی وجہ سے جادۂ

فکر کو بڑا نقصان پہنچا ہے۔ اقبال نے اس رجحان کو نا پسند کیا اور زہرِ قاتل قرار دیا۔

"حقیقت یہ ہے کہ کسی مذہب یا قوم کے دستور العمل یا شعار میں باطنی مفہوم تلاش کرنا یا باطنی معانی پیدا کرنا اصل میں اس دستور العمل کو مسخ کر دینا ہے اور یہ ایک نہایت Subtle طریقہ تنسیخ کا ہے"۔[۱]

اس طرزِ تنسیخ نے مجاز و حقیقت کی توجیہات کو بڑے دل کش پیکر دیئے ہیں۔ فرد اور معاشرے کی ذہنی و جسمانی ناآسودگی کا نسخۂ شفا سمجھ کر اسے کسی تردد یا کراہت کے بغیر خوش آمدید کہا گیا۔ اس نظریہ میں ہر بوالہوس کے لئے لطف اندوزی کا جواز پیدا کیا گیا۔ سکر کی لذت پرستی کے لئے نقدِ حیات کو پسِ پشت ڈال دیا گیا۔ حد ہے کہ صحفِ سماوی میں بھی باطنی مفہوم کی تلاش کا سلسلہ جاری ہوا۔

اسی پر اکتفا نہیں گیا علم سینہ کو مشاہدات کے متوازی ایک پُر اسرار مرکزِ عرفان قرار دیا گیا۔ تشریعی قوانین کے برعکس دوسرے ضابطۂ فکر و عمل کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ پھر شاعری کی زبان سے ترسیل نے اسے زیادہ دل کشی بخشی اقبال نے ایک خط میں لکھا ہے۔

"تصوف کا پہلا شاعر عراقی ہے۔ جس نے "لمعات" میں فصوش الحکم محی الدین ابن عربی کی تعلیمات کو نظم کیا ہے۔ (جہاں تک مجھے علم ہے فصوص الحکم میں سوائے الحاد و زندقہ کے کچھ اور نہیں) اور سب سے آخری شاعر حافظ ہے"۔[۲]

یہ وہی شاعر عراقی ہے جو قونیہ کے مدرسے فارغ ہے۔ یہ مدرسے ابن عربی کا مرکزِ درس و ہدایت رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں عراقی براہ راست ابن عربی سے مستفیض ہوا ہے۔ اور ابن عربی نے بالواسطہ طور پر نوفلاطونیت سے اکتساب کیا ہے۔ اس شاعری نے روایت قائم کی ابتدائی ایرانی شعرا کے خمیر میں مجوسیت کا خون اور پرانے عقائد کی بازگشت

---

[۱] اقبال نامہ حصہ اول ص ۳۷ [۲] اقبال نامہ حصہ اول ص ۴۴

موجود تھی۔ عربوں سے وہ مغلوب ہو گئے تھے۔ مگر ان کے عقائد و افکار میں زرتشتی عناصر غیر شعوری طور پر کارفرما رہے ہیں۔ علامہ شبلی نے فردوسی کے باب میں بڑی صراحت سے اس نفسیاتی کشاکش پر بہت ہی فکر انگیز گفتگو کی ہے۔ متعدد محققین نے لکھا ہے کہ تصوف میں مجوسی عقیدے کے اثرات بہت نمایاں ہیں۔ ایران کے آب و گِل کی تروتازگی نے تصوف کو سب سے زیادہ دلآویزی بخشی ہے۔ یہ سرمایۂ فکر و نظر ہندوستان پہنچ کر دوآتشہ ہو گیا۔ یہاں ویدانت اور بدھ افکار نے اور بھی جلا بخشی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تصوف مختلف نظریہ و عقائد کے اشتراک سے انفرادی مسلک کا علم بردار بن گیا۔ دوسرے لفظوں میں تصوف کی سرشت میں یونانی، ایرانی اور ہندوستانی تصورات نے اسے ایک مرکب کی شکل دی ہے۔ یہ افکار کی بات تھی جہاں تک مسلک و مذہب کا تعلق ہے۔ اس میں سامی مذاہب کے ساتھ زرتشتی، بدھ اور ہندو عقائد کے اثرات کام کرتے رہے ہیں۔ بیشتر مورخین اور محققین کا یہی نظریہ ہے۔ اقبال تنہا نہیں ہیں انہوں نے دوٹوک لفظوں میں اس کی نشان دہی کی ہے۔

> ''مسلمانوں میں یہ مذہب حراں کے عیسائیوں کے تراجم کے ذریعہ پھیلا اور رفتہ رفتہ مذہب اسلام کا ایک جز بن گیا۔ میرے نزدیک یہ تعلیم قطعاً غیر اسلامی ہے اور قرآن کریم کے فلسفہ سے اس ک کوئی تعلق نہیں۔ تصوف کی عمارت اسی یونانی بیہودگی پر تعمیر کی گئی ہے'' ؎۱
>
> اقبال نے اسے سرزمینِ اسلام کا اجنبی پودا بھی لکھا ہے۔ اس اعتراف میں اقبال تنہا نہیں ہیں۔ پروفیسر آر۔ اے۔ نکلسن نے لکھا ہے۔

The beginning of mysticism in Islam take us back to the great ascetic movement which arose largely under Christian influence during the 7th century A.D" 2

؎۱ مکاتیب اقبال ص ا

2. Ency clopaedia of Religion and Ethics vol XII Page 10

ڈاکٹر تارا چند نے اسلام کے ساتھ عیسائیت، نوفلاطونیت، زرتشتی اور مانوی عقائد کو اس کے مصادر متعین کئے ہیں۔ پروفیسر براؤن ایران کو اس کے ماخذ کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ڈوزی اور Von Kreamer کے خیال میں تصوف ویدانت سے ماخوذ ہے۔ یہی خیال داراشکوہ کا بھی ہے۔ ڈاکٹر قاسم غنی ایران اور بدھ مذہب سے اس کا رشتہ و پیوند قائم کرتے ہیں۔ [۱] وہ علامہ شبلی کی نفسیاتی تاویل کے ہم خیال ہیں۔

''چوں کہ وہ (ایران) اس وقت عربوں کے خلاف تلوار اٹھانے کے قابل نہ تھے اس لئے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے انہوں نے تصوف کی بنیاد ڈالی اور مسلمانوں کے ذہن و دماغ میں ترکِ دنیا، نفیٔ خودی اور نفس کشی جیسے سلبی خیالات اس طرح داخل کر دیے کہ رفتہ رفتہ ان کی زندگی کا عملی پہلو مضمحل ہو گیا۔ [۲]

ملک الشعراء بہار نے مانویت کو اس کا سرشمہ قرار دیا ہے۔ [۳]

اقبال نے اسی حقیقت کو ایک جگہ قلم بند کیا ہے۔

''اسلام سے پہلے بھی ایرانی قوم میں یہ میلانِ طبیعت (وحدت الوجودی) موجود تھا۔ اور اگرچہ اسلام نے کچھ عرصہ تک اس کا نشو ونما نہ ہونے دیا تاہم وقت پا کر ایرانیوں کا آبائی اور طبعی مذاق اچھی طرح سے ظاہر ہوا۔ بالفاظ دیگر مسلمانوں میں ایک ایسے لٹریچر کی بنیاد پڑی جس کی بنیاد وحدت الوجود پر تھی۔ ان شعراء نے عجیب وغریب بہ ظاہر دل فریب طریقوں سے شعائر اسلام کی تردید و تنسیخ کی ہے''۔ [۴]

مولانا عبدالماجد دریابادی کے مطالعہ کا حاصل حسب ذیل ہے۔

''تصوف کی موجودہ مسخ شدہ شکل یونانی اوہام، ایرانی تخیلات، ہندی مراسم اور دیگر غیر اسلامی عناصر کا ایک معجونِ مرکب ہے''۔ [۵]

ان حوالوں کی مدد سے تصوف کے ماخذ و منابع تک رسائی مشکل نہیں ہے۔ کلیہ کے

---

[۱] تاریخ تصوف در اسلام ص ۱۶۱ [۲] تاریخ تصوف در اسلام ص ۴ [۳] سبک شناسی ص ۱۸۹
[۴] اقبال نامہ حصہ اول ص ۳۷ [۵] تصوف اسلام ص ۲، ۳

طور پر اقبال کے نتائج سے انحراف ممکن نہیں ہے۔ اقبال نے جو کچھ بھی محسوس کیا اسے برملا پیش کیا۔ ان کے کچھ معاصر نام کے صوفیا نے اختلاف کیا اور ذاتیات کی سطح تک آ گئے بہ قول آتش:

لگے منھ بھی چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زبان بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے ذہن بگڑا

اقبال سارے اعتراضات کا علمی جواب دیتے رہے۔ صوفیا کے نہ وہ مزعومات باقی رہے اور نہ ہی ان کے قیل وقال جبکہ اقبال کی صداقتیں صدیوں محفوظ رہیں گی۔

مطالعۂ اقبال میں قرآن ہی اصل الاصول ہے باقی فروعات وتاویلات کا دفترِ بے معنی۔ اس صحفِ سماوی سے متصادم یا مغائرت رکھنے والی ہر تعلیم کی انہوں نے نفی کی ہے۔ عظمتِ آدم کی برگزیدگی کا جو تصور قرآن دیتا ہے وہ بے عدیل و بے نظیر ہے نظریۂ اسرارِ خودی اسی کے فیض سے تابندہ وتاب کار ہے۔ اس پر ضرب لگانے والے ہر فلسفے کو اقبال نے ناپسند کیا ہے۔ نفی ذات اور قطرہ ودریا کے صوفیانہ خیالات بھی ان کی فکر کے منافی ہیں اس میزان پر خواجہ حسن نظامی کو اقبال نے لایقِ اعتنا نہیں سمجھا تھا۔

''بہر حال وہ معذور ہیں۔ صوفی ضرور ہیں مگر تصوف کی تاریخ وادبیات وعلوم القرآن سے مطلق واقفیت نہیں رکھتے۔ اس واسطے مجھے ان کے مضامین کا مطلق اندیشہ نہیں ہے''۔

خواجہ صاحب سے اقبال کے ذاتی مراسم بھی تھے اور ان کے مسلک نیز مبلغِ علم سے وہ خود واقف بھی تھے۔ خواجہ صاحب پر ہی موقوف نہیں اقبال کے معاصر صوفیا میں اجتماعی طور پر وہ تبحرِ علمی نہیں تھا جو اقبال کو تنہا حاصل تھا۔ اقبال کو شکایت ہے کہ کم نظر صوفیا نے تصوف کے اعلیٰ اقدار کو جس طرح پامال کیا ہے وہ بہت ہی اندوہناک ہے وہ اخلاقی اور عملی پہلوؤں کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھتے رہے۔ مستیٔ احوال کو مذموم اور مستیٔ کردار کو بنی نوع بشر کی منہاج قرار دیتے رہے۔ سکر کی جذب ومستی قاطعِ حیات ہے۔ مراقبے اور سرود بھی فراریت اور فریبِ نظر کے سوا کچھ نہیں۔ فطرت کے مطالبات سے منھ موڑنا۔ صوفی کی طریقت میں فقط مستیٔ احوال اور سکر کی لذت میں نقدِ حیات کا گنوا دینا اقبال کو ہرگز گوارا نہیں ہے۔ ابلیس کی

مجلسِ شوریٰ ۱۹۳۶ء کی یادگار ہے پہلا مشیر اپنے آقا ابلیس سے ہم کلام ہے۔

یہ ہماری سعی پیہم کی کرامت ہے کہ آج
صوفی وملا ملوکیت کے بندے ہیں تمام
طبع مشرق کے لئے موزوں یہی افیوں تھی
ورنہ قوالی سے کچھ کمتر نہیں علمِ کلام

اُس آقا کا آخری ارشاد بھی ملاحظہ ہو۔ شرارِ آرزو ہے خالی محرومِ یقین مجاہدوں اور حاملِ قرآن کے حق میں یہی بہتر ہے کہ وہ ذات وصفات، جدید وقدیم، جیسے الٰہیات کے ترشے ہوئے لات ومنات میں الجھا رہے۔

تم اسے بے گانہ رکھو عالم کردار سے
تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات
ہے وہی شعر وتصوف اس کے حق میں خوب تر
جو چھپادے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات
مست رکھو ذکر وفکر صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کردو مزاج خانقاہی میں اسے
مجاہدانہ حرارت نہ رہی صوفی میں
بہانہ بے عملی کا بنی شرابِ الست

فکر ونظر کے حامل اشعار کے حوالوں سے ان خیالات کی تردید ہو جاتی ہے۔ جن میں گلشنِ رازِ جدید فارسی کے دوسرے اشعار کی مدد سے یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اقبال آخری ایام میں تصوف کی تنقید سے تائب ہو گئے تھے بعض مفاہم کی غلط تاویلات سے یہ گمان گزرتا ہے کہ اقبال کی گریز پائی گرویدگی میں بدل جاتی ہے۔ میکش اکبرآبادی لکھتے ہیں:

"اقبال کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ علمائے ظاہر کی خشک تعلیم اور فلسفۂ مغرب کی سرد مادیت پر اقبال کی روحانیت رفتہ رفتہ فتح حاصل کرتی گئی ہے اور وحدت الوجود کی مخالفت کے ساتھ صوفی شعراء کی مخالفت بھی ختم ہو گئی"۔ (نقدِ اقبال)

موصوف وحدت الوجود کے برے مبلغ ہیں ار پوری کتاب میں اس کا جواز فراہم کیا ہے۔ مگر اس کے معترف ہیں کہ

''جہاں تک وحدت الوجود کا تعلق ہے یہ نظریہ سوائے نفی محض اور ثنویت کے کسی اور نظریہ سے نہیں ٹکراتا''۔

گلشنِ رازِ جدید کو پیشِ نظر رکھ کر غلطی وگمان کا در کھولا گیا۔ اشعار میں تاویل وتفہیم کی بڑی گنجائش ہوسکتی ہے۔ مثلاً میکش صاحب لکھتے ہیں کہ علامہ صوفیوں کی طرح خودی کی تکمیل کے لیے فنا کو ضروری سمجھتے ہیں دلیل میں یہ شعر درج کرتے ہیں'

بخود گم بہرِ تحقیقِ خودی شو

انا الحق گوئے وصدّیق خودی شو

انا الحق اور بخود گُم تو خیال کی خیر خواہی میں قبول کرلیا گیا مگر تحقیق خودی یا صدیق خودی کو نظر انداز کردیا گیا۔ بعض بزرگوں نے اپنی حمایت میں یہ دلیل دی ہے کہ اقبال کا صوفی شعرا سے انحراف قرار واعتراف میں بدل جاتا ہے۔ جیسے عراقی وسنائی وغیرہ یہاں اس امر پر آپ کا التفات چاہتا ہوں۔ مطالعۂ اقبال میں ہ بات بہت فکر انگیز ہے کہ وہ اپنے نظریہ کی حمایت میں متضاد عناصر سے استفادے میں پس وپیش نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ روحانیت کے علم برداروں کے ساتھ مارکس اور اینجلز بھی ہم دوش ہیں۔ خاک نشینوں کے ساتھ عظمت وجاہ کے پیکر بھی پسند ہیں غرض اقبال کی تخلیقات میں صوفیا علماء شعراء مفکرین امرا وسلاطین کے دلآویز پیکروں کا یک مرقع موجود ہے۔ جو بلاشبہ دنیا کی ادبی تخلیقات کا جوہر فن نہ بن سکا۔ یہ اعزاز صرف اقبال کو حاصل ہے۔ چنانچہ ان کتابوں کو ملاحظہ فرمائیں جوان ذیلی اور ضمنی اشاروں سے اکتساب کرتی ہیں جیسے اقبال کے ممدوح صوفیا، اقبال کے ممدوح علماء وغیرہ۔

دوسرا اہم نکتہ بھی پیش نظر رکھیے۔ اقبال نے اکثر کل سے صرفِ نظر کیا ہے اور شخصیت کے ایک جزوی حصے کی حمامیت میں غلو کی حد تک اپنی وارفتگی کو وقار بخشتا ہے۔ اس سے غلط فہمی اور بدگمانی بھی پیدا ہوتی ہے۔ معاش ومعیشت کے موید یا مزدوروں کی مسیحائی کے لئے حکیم

معاش کو اقبال نے جو خراج پیش کیا ہے وہ ایک طبقہ کو ناپسند خاطر ہے شاہینی صفات اور مسیولینی کی ندرتِ فکر اور ذوقِ انقلاب کی ستایش کی وجہ سے ترقی پسند حضرات نے اقبال کو ہدف بنایا۔ اس استنباط اور استخراج کے عمل میں یہ غالباً فراموش کر دیا گیا کہ اقبال کے افکار و آرا کو جن عناصر کو تقویت ملتی ہے اسے اپنانے میں وہ عار نہیں محسوس کرتے فلسفہ عجم میں رومی پر تنقید موجود ہے۔

خودی سے اس طلسمِ رنگ و بو کر توڑ سکتے ہیں
یہی توحید تھی جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا
نہ ایراں میں رہے نہ توراں میں رہے باقی
وہ بندے فقر تھا جن کا ہلاک قیصر و کسریٰ
وہ چنگاری خس و خاشاک سے کس طرح دب جائے
جسے حق نے کیا ہو نیستاں کے واسطے پیدا

اسی غزل میں درمیان کے دو اشعار ممدوحِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ہیں جو ادبیات عالم میں لافانی و لاثانی ہیں عطار و رومی، رازی و غزالی پسند ہیں مگر اقبال کے اپنے شرائط پر۔

عطار ہو رومی ہو رازی ہو غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی
سکھادئے ہیں اسے شیوہ ہائے خانقہی
فقیہ شہر کو صوفی نے کردیا ہے خراب

اسی طرح فصوص الحکم کو الحاد و زندقہ کہنے والے اقبال نے نظم تقدیر (ضربِ کلیم) کو ابنِ عربی سے ماخوذ بنایا ہے جس کا آخری شعر توجہ طلب ہے:

دے رہا ہے اپنی آزادی کو مجبوری کا نام
ظالم اپنے شعلۂ سوزاں کو خود کہتا ہے دود

اقبال کی تحریروں میں تحریف وتعبیر کی تشویش ناک صورتیں

تمام ذرائع ابلاغ میں تحریر کو تقدیس کی عظمت حاصل ہے۔ صحائف سماوی میں لوح وقلم کی برگزیدگی بلاوجہ نہیں ہے۔ یہ انسانی افکار کا سب سے موثر وسیلۂ اظہار ہے۔ فرد اور اس کی تہذیب کے تمام تصورات کی محافظ بھی یہی تحریر ہے۔ ہمارے مشاہدے میں یہ اعجوبہ بھی کم حیرت ناک نہیں ہے کہ تحریر میں ہی تحریف وتغیر کی سب سے زیادہ مکروہ مثالیں ملتی ہیں اصل عبارت کا ارادتاً مسخ کیا جانا بھی انسانی مزاج کی عجیب افتاد ہے۔ خواہ وہ نیک نیتی پر ہی مبنی کیوں نہ ہو۔ اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ پڑھے لکھے یا باشعور انسانوں کے ہی کرشمے اور کارنامے ہیں۔ رفتہ رفتہ زمانے کے بردباد ہاتھوں سے تحریف وتنسیخ کی زیادتی اصل عبارت کو ہی موہوم بنادیتی ہے۔ اس سے زیادہ اور کیسا فساد ہوسکتا ہے کہ وحی وتنزیل کی تجلیات سے معمور تحریریں بھی محفوظ نہ رہ سکیں۔ انسان ایک مفسدانہ مزاج کا بھی مالک ہے۔ وہ اپنے تصورات یا تعمل سے فسادِ خلق کے لئے برسرِ پیکار رہتا ہے۔ قدیم تاریخ ہو یا تحریر اس کے فتنے ہمیشہ سرگرمِ کار رہے ہیں۔ ہمارا زمانہ بھی اس سے خالی نہیں ہے۔ اقبال کی تحریریں بیسویں صدی کی بازیافت ہیں۔ ان کی وفات کے بعد ہی شعوری اور غیر شعوری تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ ان میں ان کے اقربا اور عقیدت مندوں نے زیادہ گل کھلائے ہیں۔ جب ہمارے سامنے یہ سب کچھ سرزد ہوسکتا ہے تو ماضی بعید کا کیا

حال ہوگا۔ اردو کے کلاسیکی سرمایۂ ادب کا ایک حصہ آج بھی مشتبہ ہے کیوں کہ وہ الحاق وانتساب کی کوتاہیوں سے پاک نہیں ہے۔ خواہ وہ شعرِ سودا ہو یا کلامِ میر۔ ڈاکٹر نسیم احمد نے غزلیاتِ سودا کی مدوین کر کے ایک قابلِ رشک کارنامہ انجام دیا ہے۔ کلامِ میر بھی ایسے ہی مردِ تحقیق کا منتظر ہے۔

زندگی کے کوائف، فکر ونظر کی باز آفرینی اور تخلیق کے تناظر اقبالیاتی تحقیق کے تین زاویے متعین کیے جا سکتے ہیں۔ ان کا اطلاق کم وبیش ہر فنکار پر ہوسکتا ہے۔ اقبال چوں کہ مفکر شاعر ہے اس لئے بھی ان کے افکار وآرا کی باز آفرینی اور ان کے نتائج تک رسائی خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس مقام پر متن کی ناگزیر اہمیت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ یوں بھی ادبی مطالعہ میں متون کی تنصیف وتقدیس کے احترام سے گریز پائی ممکن نہیں کیوں کہ انہیں پر آہنگ واسالیب کا مدار قائم ہے۔ متن پر متوجہ ہوئے بغیر اسلوب وانشا پر گفتگو نہیں کی جاسکتی اور حقایق کی تمام تر اساس بھی تحریر پر ہی موقوف ہے۔ برا ہو مغرب کی فتنہ پروری کا جو متن کے مضمرات کی ہی منکر ہے۔ اس کا منشا ومقصود صحفِ سماوی کی تنزیل کو بھی مشتبہ بنا دینا ہے۔ کیوں کہ دنیائے تحریر میں محفوظ متن کے معجزات کی حامل صرف ایک کتاب ہے جس میں تحقیقِ متن کے پانچ ارکان ملزوم قرار دیئے گئے ہیں۔ یعنی کلام کس کا ہے؟ راوی کون ہے؟ روایت کا مخاطب کون ہے؟ زبان کون سی ہے؟ اور روایت کے استناد کیا ہیں۔

اقبال کے افکار کے منبع وماخذ کے متعلق تحقیقات کو یہاں زیرِ بحث نہیں لایا جارہا ہے۔ اور نہ زندگی کے متعلقات سے سروکار رکھا گیا ہے۔ اقبالیاتی تحقیق کا پہلا زاویہ ان کی حیات کے متعلق ہے جس میں ان کے آباواجداد، مولدومسکن، تعلیم وتربیت، سفرحضر اور معاملاتِ زندگی سے متعلق حقایق شامل ہیں۔ ان موضوعات پر اقبال کی زندگی میں ہی مباحث شروع ہو چکے تھے اور انھیں کافی حد تک محفوظ بھی کرلیا گیا تھا۔ وہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اس کا اندازہ ڈاکٹر سعید درانی کی مفید کتاب ''اقبال یورپ میں'' ''نوادراتِ اقبال'' یا پروفیسر نکلسن کے ترجمہ ''اسرارِ خودی'' پر اقبال کے حواشی کی دریافت ڈاکٹر جاوید اقبال کی زندہ رود وغیرہ کوششیں شامل ہیں۔

مولوی احمد دین کی کتاب ''اقبال'' ۱۹۲۳ء میں پہلی بار شائع ہوئی تھی اس کتاب کا تحقیقی ایڈیشن اردو کے موقر محقق ڈاکٹر مشفق خواجہ نے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ دوسری جہت ان کے منظوم اور نثری تحریروں کی باز آفرینی ہے جو بڑا کارنامہ ہے۔ یہ تحریف و تنسیخ کی مثالوں سے بھی پُر ہے۔ حیرت ہے کہ اس دور میں بھی راویوں کی غیر صحت مند صورتِ حال سے کیسے عبرت ناک نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ ان کا اندازہ ان کے خطوط کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔ اقبال کی ہر ہر سطر کو محفوظ کرنے کی کوشش بھی ہماری سعی و تحقیق کی دلچسپ داستان ہے۔ اس ضمن میں ان کے خطوط کی تلاش و ترتیب کا کام سرِفہرست ہے۔ تقریباً سولہ سو سے زائد خطوط کی اشاعت ہو چکی ہے۔ جو خود ایک حیرت خیز واقعہ ہے۔ اور خطوط میں ہی سب سے زیادہ غلطیاں درآئی ہیں۔ یہ غلطیاں دو طرح کی ہیں اصل متون کے پڑھنے میں اور نقل کرنے میں مرتبین کی لاپرواہی یا کم نظری نے گل کھلائے ہیں۔ یا پھر خطوط میں دانستہ طور پر جعل اور تحریف شامل ہیں۔

خطوط میں تحریف کی دو مثالیں بہت نمایاں ہیں۔ اقبال کے بھتیجے اعجاز احمد نے اپنے مخصوص مذہبی عقیدے کی پردہ پوشی کے لئے اقبال کے ایک خط میں جو تبدیلی کی ہے یا کرائی ہے وہ بشری کمزوری کے ساتھ کتمانِ حق کی بڑی بھونڈی مثال ہے۔ سر راس مسعود کے نام اقبال کا یہ خط ایک طرح سے وصیت نامہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس میں بچوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داریوں کے لئے چند افراد کے انتخاب کے لئے مجوزہ نام شامل ہیں۔ اصل عبارت ہے:

> ''شیخ اعجاز احمد میرا بڑا بھتیجا ہے۔ نہایت صالح آدمی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ دینی عقائد کی رو سے قادیانی ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ ایسا عقیدہ رکھنے والا آدمی مسلمان بچوں کا Guardian ہو سکتا ہے یا نہیں اس کے علاوہ خود بہت عیال دار ہے۔''[۱]

عقیدے سے متعلق عبارت حذف کر دی گئی ہے۔ یہ ایک عبرت ناک پہلو ہے کہ اقبال کے متون میں تحریف ان کے بھتیجے کی بددیانتی کے سبب وارد ہوئی دوسری طرف شعری

متون کی ترتیب وتدوین میں نامناسب تبدیلیاں خود ان کے صاحب زادے ڈاکٹر جاوید اقبال نے کی ہے۔ گویا گھر کے ہی چراغ سے ایوانِ اقبال میں چنگاری لگی ہے۔ اسی طرح ممنون حسن خاں مرحوم کے نام منسوب خطوط بھی تحریف شدہ ہیں۔ جو اصلاً ڈاکٹر راس مسعود کے لئے لکھے گئے ہیں۔ ان خطوط کے اصل متون کی باز آفرینی اور تحقیقی مطالعے نے ایک نئی راہ کی نشاندہی کی ہے۔ اسی طرح ملک اشفاق نے پنڈت نہرو کے نام A Bunch of Letters کے ترجمہ میں اقبال کے خط کے ترجمے میں اپنے مخصوص عقیدے کی حمایت میں عبارت ہی بدل دی ہے۔

اقبال نے خط میں لکھا ہے:

"میرے ذہن میں کوئی شبہ نہیں کہ احمدی اسلام اور ہندوستان دونوں کے غدار ہیں۔"

I have no doubt in my mind that the Ahmades are traitors both to Islam and India.

ترجمہ ملاحظہ فرمایئے

"احمدیوں اور مسلمانوں میں زیادہ اختلاف نہیں ہیں اور احمدی نہ ہی اسلام اور نہ ہی ہندوستان کے لئے دہشت گرد ہیں۔"[۲]

مستزاد یہ ہے کہ اس خط کی اور دیگر اہم عبارت بھی حذف کردی گئی ہے جو ردِ قادیانیت میں ہے۔ اقبال کے خط میں ۱۶ جملے ہیں مترجم نے صرف ۷ جملے ہی نقل کئے ہیں۔ کیوں کہ دوسرے جملے ان کے عقیدے کے خلاف ہیں۔ جب کہ یہ پوری کتاب ترجمہ ہے اس کتاب کو اُردو میں پہلا ترجمہ کہا گیا ہے جب کہ اس سے پہلے ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ یہ تحریف کی بدترین مثال ہے۔

دنیائے ادب میں مکتوباتی ادب کی ایک مستقل حیثیت تسلیم شدہ حقیقت ہے۔ تخلیقی فن میں بہت سی جہتیں ادھوری اور صراحت سے عاری ہوتی ہیں خطوط میں نجی زندگی کے

ساتھ جلوت وخلوت کے افکار واسالیب بہت ہی واشگاف انداز میں بیان ہوتے ہیں۔اور پھر کسی مفکر فن کار کے تمام وکمال تجزیے کے لئے ان کے خطوط ناگزیر بن جاتے ہیں۔ اقبال کے مطالعے میں یہ خطوط ان کی شعری تخلیقات کی تفہیم کے لئے بھی بڑے معاون ہیں۔ان کی فکر ونظر کے کئی ایسے پہلو ہیں جن کا ذکر اشعار میں نہیں ملتا اور خطوط میں آشکار ہیں۔غالباً یہی وجہ ہے کہ خطوط کی جمع وتدوین پر خاطر خواہ توجہ دی گئی ہے۔

خطوط میں جعل سازی کی کوششیں بھی قابلِ مذمت ہیں۔گمراہی پیدا کرنے کی ناز یبا بد نیتی بھی خطوطِ اقبال میں راہ پاگئی ہے۔مکاتیبِ اقبال میں ڈاکٹر لمعہ حیدر آبادی کے نام منسوب خطوط کا جعل محترم 'ماسٹر اختر' (۳) کی کوششوں سے طشت از بام ہو چکا ہے۔ عبدالواحد معینی نے لکھا تھا:

''اتنا بڑا جعل اردو ادب کی تاریخ میں شاذ ونادر ہی سرزد ہوا ہوگا''۔[۴]

ڈاکٹر تاثیر نے بھی انہیں مشتبہ ومشکوک قرار دیا ہے۔اقبالیات کے معروف ماہرین بھی ڈاکٹر لمعہ کے جعل کے مغالطے میں آگئے تھے۔چوروں کو ہتھیلی پر چراغ لے کر چلنے کی دلاوری کے قصے تو ہماری یادداشتوں میں ضرور محفوظ ہیں مگر چوروں کی حمایت میں پروفیسر اور گورنر کی صف آرائی کی مثال بھی ایک عجوبہ ہے۔اقبال نامے کی اشاعت کے وقت یعنی ۱۹۴۵ء میں شیخ عطاء اللہ نے خطوط کے جو بھی اصل ونقل ملے سب کو شاملِ کتاب کرلیا۔بھلا ہو ماسٹر اختر صاحب کا جنھوں نے جگر کاوی کی اور اس جعل سازی کا راز فاش کیا۔ڈاکٹر اکبر رحمانی بھی زد میں آئے جنھوں نے انھیں خطوط کی بنیاد پر پونہ یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی کی سند بھی حاصل کی تھی اور ڈاکٹر لمعہ کی حمایت میں اتنے من گھڑت جھوٹ جمع کیے کہ ادبی تاریخ میں کذب کی ایسی کریہہ صورت نہ ملے گی۔ان کی کتاب ''تحقیقات وتاثرات'' دروغ گوئی کا سب سے مذموم اور سفلانہ مظاہرہ ہے۔حیرت کی بات ہے کہ ان ٹھوس شہادتوں کے باوجود جناب مظفر حسین برنی نے ''کلیاتِ مکاتیبِ اقبال'' کی ترتیب میں ان خطوط کو شاملِ متن رکھا اور تحقیق کا مذاق اڑایا ہے۔اقبال کے خطوط کی ترتیب وجمع واشاعت کا یہ سب سے اہم

اور مفید کارنامہ ہے۔ مگر تحقیق وتدوین کی اعلیٰ کاوشوں سے عاری اور سہل پسندی کا مظہر بھی ہے۔ برنی صاحب (۵) نے جن معاونین کی خدمات حاصل کیں انہوں نے کمالِ احتیاط سے گریز کیا۔ خطوط کے عکسی متون کی نقل وقرأت میں بڑی فاحش غلطیاں راہ پاگئیں مزے کی بات یہ ہے کہ بعض اہلِ قلم نے اسے مستند قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے ایک مبسوط تبصرہ شائع کر کے ان غلطیوں کی نشان دہی کی ہے۔ جس کی روشنی میں مرتب نے آخری جلد میں سو صفحات کا صحت نامہ تیار کیا اور ڈاکٹر تحسین فراقی کے شکریہ کے بغیر ابتدائی جلدوں کی ان غلط عبارتوں کی تصحیح فرمائی۔ پھر بھی ڈاکٹر لمعہ کے خود ساختہ خطوط کو شامل ہی رکھا۔ (جیسے بھوپال والی غزل دیوان غالب کی زینت بنی رہی) افسوس ہے کہ یہ جتنا بڑا کام تھا اتنی ہی بڑی غلطیاں راہ پاگئیں۔ مرتب شہرت وسیم سے زیرِ بار ہوئے مگر ترتیب کا کام نقائص کے انبار سے شرمندہ ہی رہا۔ ہر صفحے پر ایک دو غلطی کا تناسب ہے۔ پانچ سو سے زائد غلطیاں موجود ہیں۔ عبارت اور جملے ہی بدل گئے ہیں اصل تحریر کو سنجیدگی سے پڑھا ہی نہیں گیا۔ ماہ وسال کی متعدد غلطیاں اضافے کے طور پر شامل ہوگئی ہیں۔ جملوں میں من مانی تحریف کی وجہ مفہوم بھی کہیں کہیں خبط ہوگیا ہے۔ فسادِ متن کی ایسی مکروہ مثالیں شاید ہی کہیں ملیں۔ جب کہ یہ سرکاری سرپرستی اور زرِ کثیر کے اسرافِ بے جا سے شائع ہوا ہے۔ جعل وفساد سے معمور متون کی کارفرمائی ہر دور میں دیکھنے میں آتی ہے۔ دین دھرم کی کتابیں بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکیں۔ اقبال سے منسوب بہت سے ملفوظات بھی استناد کے منتظر ہیں جو بربنائے عقیدت اقبالیات میں شامل ہیں خطوط کے سلسلے میں یہ ایک اچھی سہولت ہے کہ ان کے ایک بڑے حصہ کی عکسی تحریریں دستیاب ہیں۔ جن کی صحیح قرات کی جاسکتی ہے۔ اگرچہ اقبال کی تحریروں کو پڑھنا قدرے مشکل بھی ہے۔ برنی صاحب اور اُن کے مددگار تحریر بھی نہ پڑھ سکے۔ سہل پسندی کے سبب یہ سب کچھ ہوا ہے۔

نثری تحریروں کے علاوہ ان کے شعری متون میں ترمیم واضافے نے بھی دشواریاں پیدا کی ہیں۔ جن سے کہیں کہیں راہِ اعتدال سے ہٹ جانے کا امکان باقی رہتا ہے۔ اشعار کے متن میں حذف واضافے کہیں کہیں خود اقبال کے قلم سے ہوئے ہیں (۶)۔ اس کا ایک

تاریخی پس منظر ہے۔ اقبال کے ایک عقیدت مند مولوی عبدالرزاق حیدرآبادی (۷) نے ۱۹۲۴ء میں رسائل و جرائد کی مدد سے مطبوعہ اردو کلام کو یکجا کر کے شائع کر دیا۔ جو اقبال کی ناگواری کا باعث بنا۔ لیکن اس اشاعت نے انھیں آمادہ کیا کہ اردو کا پہلا شعری مجموعۂ کلام شائع کیا جائے۔ اقبال نے ۱۹۰۱ء سے ۱۹۲۴ء کی اردو تخلیقات کو مرتب کیا۔ مگر ستم یہ کیا کہ بہت سے اشعار حذف کر دئے اور اضافے بھی کیے۔ خاص طور پر کئی ابتدائی نظموں کی صورت ہی بدل گئی۔

تحقیق میں یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ مصنف کے قلم سے نکلی ہوئی آخری عبارت ہی مستند اور مرجح ہے۔ گویا پایانِ عمر کی تصحیح شدہ تحریر پر ہی اصل متن کا اطلاق ہوتا ہے۔ اساسی متن کے تعین میں اس کلیہ سے اتفاق ضروری ہے۔ لیکن جب فکر و نظر کی شرح و بیاں کا معاملہ ہو تو اس کلیہ پر اکتفا نہیں کیا جا سکتا۔ صرف ایک مثال پر توجہ چاہوں گا۔ نظم ''سید کی لوحِ تربت (۸)'' ۱۹۰۳ء میں تخلیق کی گئی۔ ۱۹۲۴ء میں بانگِ درا کی ترتیب کے وقت بہت سے اشعار حذف کیے گئے اور کئی دوسرے اشعار کا اضافہ کر دیا گیا۔

بندۂ مومن کا دل بیم و رجا سے پاک ہے
قوتِ فرماں روا کے سامنے بے باک ہے

اس شعر کے اضافے نے کئی نقادوں کو گم راہ کیا۔ جب اقبال کے فکر و نظر کے منابع و مصادر کی تلاش کا کام پیشِ نظر ہو اور مشرق و مغرب کی کشاکش بھی درمیان میں حائل ہو تو غلط فہمی کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ مردِ مومن سے متعلق تصورات کی ایک نسبت مغرب یعنی نٹشے سے دی جاتی ہے پھر یہ بات بہ سہولت کہی جا سکتی ہے کہ ۱۹۰۴ء تک اقبال نٹشے کے نام سے بھی آشنا نہ تھے۔ گویا مردِ کامل کا تصور مشرق سے ماخوذ ہے۔ دلیل مذکورہ بالا شعر ہے۔ ۱۹۲۴ء کی فکر پر ۱۹۰۳ء کا اطلاق دلیل کم نظری ہی نہیں گمرہی ہے۔ متن کی صحت پر ہی فکر و نظر کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔ اور صحتِ متن کا تعین جگر کاوی کا سودا ہے۔ جس میں زیاں کے سوا کچھ نہیں۔ ۱۹۰۳ء میں اس نظم میں ۳۴ اشعار تھے۔ بانگِ درا میں صرف ۱۴ اشعار ہی درج ہیں۔ جب کہ دو اشعار اضافے کے طور پر شامل کر لئے گئے ہیں۔ مذکورہ شعر بھی اضافہ میں

ہی شامل ہے۔ اس طرح ۳۴ اشعار میں صرف ۱۲ کا انتخاب کیا گیا۔ باقی حذف کر دیے گئے۔ اسی نظم میں اقبال نے اپنی یادداشت یا کسی غیر مصحح نسخے کی بنیاد پر مرزا صائب کے ایک شعر کا غلط متن پیش کیا ہے۔ مصرع کی ترتیب بھی بدل دی ہے۔

آب چوں در روغن افتد نالہ خیزد از چراغ
صحبتِ ناجنس باشد باعثِ آزار ہا

جب کہ صحیح متن کی قرأت اس طرح ہے:

صحبتِ ناجنس آتش را بفریاد آورد
آب در روغن چو باشد می کند شیون چراغ (۹)

کئی اشعار ایسے ہیں جنھیں اقبال نے صرف یادداشت کی بنیاد پر کلام میں درج کیے ہیں۔ جو اصل متن سے ذرا مختلف ہیں۔ انھیں اسباب سے اقبال کے متروک کلام کی جمع و ترتیب کے طفیل تقریباً دس کتابیں وجود میں آئیں۔ جن میں نوادرِ اقبال، سرودِ رفتہ اور گیان چند جین کی اقبال کا ابتدائی کلام اور صابر کلوروی کی ''کلیاتِ باقیاتِ شعرِ اقبال'' کافی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان سب کے باوجود کلامِ اقبال میں ترک والحاق کی وجہ سے دشواریاں بھی چندرچند ہیں۔ باقیات میں الحاق واضافے کی ایک اور گمراہ کن مثال ملاحظہ ہو، جس کی نشان دہی (۱۰) پروفیسر سید محمد حنیف نقوی نے کی ہے۔ غزل کے تین شعر:

کب ہنسا تھا کہ جو کہتے ہو کہ رونا ہوگا
ہو رہے گا مری قسمت میں جو ہونا ہوگا
خندۂ گل پہ مجھے آج تو ہنس لینے دو
پھر اسی بات پہ رولوں گا جو رونا ہوگا
ہم کو اقبال مصیبت میں مزا ملتا ہے
ہم تو اس بات پر ہنستے ہیں کہ رونا ہوگا

یہ اشعار ''باقیات اقبال' مرتبہ عبدالواحد معینی مع ترمیم واضافہ عبداللہ قریشی (۱۱) مطبوعہ لاہور ۱۹۷۵ء میں شامل ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ اشعار اقبال کے طبع زاد نہیں ہیں۔

ان کے ایک ہم تخلص خواجہ غلام محمود اقبال بنارسی متوفی ۱۹ ستمبر ۱۹۴۹ء بہ مقام ڈھاکہ کے اشعار ہیں۔

یہ تینوں اشعار باقیاتِ اقبال کا حصہ بن کر استناد کا درجہ رکھتے تھے لیکن اس انکشاف کے بعد اقبال سے ان اشعار کی نسبت ختم ہو جاتی ہے۔ ان اشعار کے متن میں معمولی سی تبدیلی بھی ہے۔ اقبال بنارسی کے اشعار کی قرأت قدرے مختلف ہے۔ پہلے شعر کے مصرع اولیٰ میں ''کہتے'' کی جگہ ''بگڑتے'' ہے۔ دوسرے شعر کے پہلے مصرع میں ''مجھے'' کی جگہ ''ہمیں'' درج ہے اور دوسرے مصرع میں ''اس بات پر'' کی جگہ ''یہ سوچ کے''۔ اقبال بنارسی کی غزل کے باقی تین اشعار حسب ذیل قرأت رکھتے ہیں:

اک طرف دوست کا اصرار کہ آنکھیں کھولو
اک طرف موت تھپکتی ہے کہ سونا ہوگا
شوق سے آپ نقابِ رُخِ زیبا الٹیں
ہو رہے گا مری قسمت میں جو ہونا ہوگا
ایسے دریا میں سلامت رویِ نوح کہاں
پار ہونا ہے تو کشتی کو ڈبونا ہوگا

حیرت کی بات ہے کہ حال ہی میں ڈاکٹر صابر کلوروی نے اپنے مرتب کردہ ''کلیاتِ باقیاتِ شعرِ اقبال'' (۱۲) میں نقل کردہ ابتدائی تینوں اشعار کو اقبال سے ہی نسبت دی ہے۔ اگرچہ ان کا یہ مرتب کردہ کلام ان کے تحقیقی مقالے کا ہی جزو ہے۔ انھیں بھی غلط فہمی ہوئی ہے۔ اور شاید پروفیسر سید محمد حنیف نقوی کی تحقیق کی اطلاع ان تک نہیں پہنچ سکی۔ یہ کلام تازہ ترین باقیات کا حصہ ہے جس کا ہندوستانی ایڈیشن ۲۰۰۴ء میں دہلی سے شائع ہوا ہے۔ باقیات کا یہ سب سے گراں قدر مجموعہ ہے۔ جس میں ان کے بہ قول تقریباً ساڑھے سات سو اشعار کا اضافہ ہوا ہے۔ جن میں دو تہائی کلام کا حصہ غیر مطبوعہ بھی ہے۔ نوادرات یا باقیات کے تحقیقی یا تنقیدی مطالعہ میں ڈاکٹر صابر کلوروی کا یہ بیش بہا کارنامہ اقبالیات میں ایک ناگزیر حیثیت رکھتا ہے پھر بھی راہِ تحقیق و تدوین کے دروازے بند نہیں ہیں۔ حیرت ہے کہ ان کی

اس یادگاری تحقیق میں متن کی غلطیاں راہ پا گئی ہیں جیسے مثنوی گلزارِ نسیم کے چند اشعار کو اقبال کے متروکات میں شامل کرلیا گیا ہے۔ حفیظ جالندھری کے بھی چند شعر متن میں شامل ہو گئے ہیں جن سے اس کتاب کے استناد پر حرف آتا ہے۔ شکر ہے کہ انہوں نے ''حریفِ مئے مردافگنِ تحقیق'' کا دعویٰ نہیں کیا۔ جب کہ سینکڑوں غلطیوں کے طومار سے معمور کلیاتِ مکاتیبِ اقبال کے مرتب جناب مظفر حسین برنی نے انتساب میں اپنے بارے میں ''حریف مئے مردافگنِ تحقیق'' کی ادعائیت سے تحقیق وتدوین کو شرمسار کیا ہے۔ ڈاکٹر صابر کلوروی نے مذکورہ تینوں اشعار ''باقیاتِ اقبال' سے اخذ کیے ہیں۔ اسے دورِ اول کی تخلیقات کے ذیل میں پیش کیا ہے۔ معمارِ اول کی کج روی کی بنیاد پر قائم ہونے والی اور اوجِ ثریا کو شرمانے والی عمارت اندیشہ ہائے دور دراز سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔ یہ واقعات ابھی ہماری صدی کے مفکر شاعر سے منسوب ہیں۔ ذرا سوچیے کلاسیکی ادب کا کیا حال ہوگا۔ جس میں الحاق والتباس کی اَن گنت مثالیں موجود ہیں۔ متون کی بحالی یا باز آفرینی جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ تحقیق میں حرفِ آخر نہیں ہوتا اور نہ رعایتی نمبر ہی ہوا کرتا ہے۔ آج کی دریافت کل غلط ثابت ہوسکتی ہے۔ فکر ونظر کا کارواں ماضی وحال کی دریافت سے گراں بار ہوکر گامزن رہتا ہے۔ محاسبہ بھی ایک ناگزیر عمل ہے جو تحقیق وتنقید کو مہمیز کرتا رہتا ہے۔

بات یہیں ختم نہیں ہوتی بہت دور تک گمراہی پھیلاتی ہے۔ سلسلہ در سلسلہ اندیشے کا امکان بڑھتا جاتا ہے۔ جس کے بڑے بھیانک نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ ۱۹۸۳ء کے تعلیمی سال کے دوران عائشہ خاتون (۱۳) نے اردو غزل کے معروف اشعار کی تصحیح وتحقیق کے عنوان سے ایم فل کا مقالہ لکھا۔ اقبال بنارسی کی غزل کے آخری دو اشعار کا اضافہ بھی کیا اس طرح گمراہی کا یہ سلسلہ نہ جانے کب تک غلط فہمیوں کا سبب بنتا رہے گا۔ جب کہ ابھی یہ بیسویں صدی کی بات ہے۔ یہ مقالہ ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ اردو فارسی میں ہم نام تخلص نے بھی بڑے مغالطے پیدا کیے ہیں۔ حیرت ہے کہ گیان چند جین نے بھی فریب کھایا اور ان اشعار کو اقبال سے ہی نسبت دی ہے۔

متداول ومروج اردو فارسی کلیات میں بھی کثیر الاشاعتی اسباب سے کہیں کہیں متن

متغیر ہو گیا ہے۔ اگرچہ ان کی نوعیت بہت اندوہناک نہیں ہے۔ پھر بھی نقطے وشوشے بڑی معنویت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے ان دو زبانوں میں موجود کلیات کی ان غلطیوں کی نشان دہی کی ہے۔ جن کے دور ہونے کی کوئی صورت نہیں بن پائی ہے۔ اس لئے کہ ایک متن کی تیار شدہ پلیٹیں یا فلمیں بار بار چھپتی رہتی ہیں اور ناشران ان کی درستگی کی طرف توجہ نہیں دیتا۔

تہران سے احمد سروش کا مرتبہ کلیاتِ اقبال فارسی بھی اغلاط سے پُر ہے۔ کلیاتِ فارسی پر رشید حسن خاں کا تبصرہ بھی قابلِ ذکر (۱۴) ہے۔ جس میں متن کی اشاعتوں میں مرتب کی من مانی کی عبرت ناک مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ ابھی تقدیم زمانی کا ذکر تھا۔ چار غزلیں میرے قرائن کے مطابق ۱۹۰۵ء کے بعد کی ہیں۔ مگر پروفیسر گیان چند جین (۱۵) نے انھیں ابتدائی کلام میں شامل کیا ہے اور استناد کے حوالے سے صرفِ نظر کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی داخلی شہادتوں پر بھی توجہ نہیں دی ہے۔ ان میں ایسے اشعار بھی ہیں جن میں خودی کے بہت اشارے ہیں۔ ان غزلوں کے علاوہ لفظ خودی ان معنوں میں کلامِ اقبال میں اسرار کی اشاعت سے پہلے نظر نہیں آتا۔ مجھے حیرت ہے کہ پروفیسر جین نے ناچیز کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے انھیں ابتدائی کلام میں شامل کیا ہے۔ ان کا بیان محلِ نظر ہے۔ وہ اشعار یہ ہیں:

کر نہ تقدیر کے شکووں سے خودی کو رسوا
بہر تدبیر عیاں عالمِ اسباب ہوا

خودی نے عطا کی مجھے خود شناسی
ترا حسنِ دائم مرے رو برو ہے

خودی کی حفاظت کوئی مجھ سے سیکھے
غریبی میں انداز ہیں خسروانہ

نہ ہو جب تلک دل میں ایمان کامل
خودی بھی فسانہ خدا بھی فسانہ

سرودِ رفتہ کے مرتب اور دیدہ ور دانشور غلام رسول مہر نے بھی غلط فہمی پیدا کی ہے (۱۶)۔ باقیات میں انھیں جگہ دی مگر ان کی تخلیق یا اشاعت کے حوالے سے محروم رکھا۔ مزید براں انہوں نے ان اشعار سے استنباط بھی کیا ہے کہ مردِ مومن خودی وخودداری کے تصورات اس ابتدائی دور کی فکر میں موجود ہیں۔

پروفیسر جین نے اپنی مرتب کردہ کتاب میں ناچیز کا تذکرہ دوسرے ماخذ یعنی پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی کتاب ''اقبال انیسویں صدی میں'' کے حوالے سے کیا ہے۔ حالاں کہ میری کتاب بہ سہولت مل سکتی تھی۔ خود اقبال اکیڈمی حیدر آباد کے ذخیرے میں موجود ہے اور دوسرے دوستوں کے پاس بھی ہے۔ تحقیق میں ثانوی ماخذ پر کم اعتبار کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ثانوی ماخذ پر بھروسہ کر کے زیادہ غلطی کی ہے۔ انھوں نے خود اعتراف کیا ہے۔

> ''میں اعتراف کرتا ہوں کہ اصل ماخذ بہت کم دیکھ پایا ہوں۔ مجھے متعدد نظموں کی تاریخ اشاعت نہ مل سکی۔ ان کے رنگ کو دیکھ کر تاثراتی طریقے پر ان کے زمانے کا اندازہ کیا ہے۔'' (۱۷)

راقم نے جن اشعار پر شبہ ظاہر کرتے ہوئے انھیں ابتدائی دور سے منسوب نہ کرنے کی بات کی تھی انھیں تسلیم نہ کر کے جین صاحب نے ایک بڑی غلطی کی ہے۔

> ''غزل کی اشاعت اول کا علم ہوتا تو کوئی بہتر فیصلہ کیا جاسکتا تھا۔ ویسے خودی کا لفظ ان کی ایک اور قدیم غزل میں ملتا ہے۔

خودی نے عطا کی مجھے خود شناسی
مرا حسن دائم مرے روبرو ہے (۱۸)

> یہ غزل ۱۹۰۵ء ہی نہیں ۱۹۰۸ء کی بھی نہیں ہے۔

ڈاکٹر صابر کلوروی نے اس غزل کو دورِ دوم یعنی ۱۹۰۹ء سے ۱۹۲۴ء کے کلام میں شامل کیا ہے (۱۹)۔ جس سے راقم کے خیال کی تائید ہوتی ہے اور خودی کے لفظ پر مزید گفتگو کی گنجائش پیدا ہوتی ہے۔ اس تحقیق سے غلام رسول مہر کے دعوے کی بھی تردید ہوتی ہے (۲۰)۔

ناچیز نے ۱۹۶۹ء میں اپنی پہلی اور مبتدیانہ کوشش ''اقبال کے ابتدائی افکار'' میں علامہ کے بعض ان فکری تصورات کی نشان دہی کی تھی جو یورپ جانے سے پہلے یعنی ۱۹۰۵ء تک وجود میں آچکے تھے۔ اس تجزیہ میں بانگِ درا کے حصۂ اول کے ساتھ باقیات اور نوادرات یا حذف شدہ کلام کو بھی زیر بحث لایا گیا تھا۔ نوادرات میں مجھے کچھ ایسا حصہ بھی مشتبہ لگتا تھا جسے قیاسات کی بنیاد پر راقم نے انھیں ۱۹۰۵ء کے بعد کا ہی قرار دیا تھا۔

''جن اشعار سے مرتب (غلام رسول مہر) نے بحث کی ہے وہ قرائن اور قیاس سے ۱۹۰۵ء سے پیشتر کے نہیں معلوم ہوتے''۔

(۲۱)

کم سے کم یہ چھ غزلیں بعد کی محسوس ہوتی تھیں۔ جن پر غلام رسول مہر نے ''سرودِ رفتہ'' کے مقدمہ میں تجزیہ کے بعد بعض نتائج تو اخذ کئے ہیں۔ جو میرے لیے محلِ نظر تھے۔ میرے شبہات کی بنیاد متون میں موجود بعض وہ فکری رجحانات تھے۔ جن پر اس عہد کا اطلاق نہیں ہوسکتا تھا۔ اس لئے کہ کلام میں ان الفاظ کا ذکر نہیں ملتا۔ جو بعد میں اصطلاحی صورت گری کی علامت بنے۔ یہ غزلیں ''کلیات باقیات اشعار اقبال'' میں ایک غزل کے علاوہ باقی دوسرے دور کے تخلیقات کے ذیل میں شامل ہیں جنھیں ابتدائی دور سے منسوب نہیں کرنا چاہیے۔ اور نہ ان پر اس دور کے تصورات کا اطلاق ہوگا۔

یہ چند معروضات ابتدائی دور یا محذوف کلام سے متعلق تھیں۔ اب اقبال کے مرتب کردہ اور متداول کلام میں جو تبدیلیاں راہ پاگئی ہیں وہ ہر حال میں تشویش ناک ہیں اور انھیں روکنے کے لئے سنجیدہ توجہ درکار ہے۔ کلیات اردو وفارسی منصوبہ بند طور پر سرکاری سرپرستی میں شائع کیا گیا۔ جو ڈاکٹر جاوید اقبال اور اقبال اکیڈمی لاہور کی نگرانی میں مدون ہوئے۔ الفاظ کی املائی صورتوں کی تبدیلی کے ساتھ ترتیبِ کلام میں جو اجتہادات ہوئے ہیں وہ قابلِ افسوس ہیں۔ ان کی بیشتر خامیوں پر کئی اقبال شناس ماہرین متوجہ ہوئے ہیں۔ خاص طور پر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اور رشید حسن خان نے ان ناروا لغزشوں کی نشان دہی کی ہے۔ ان تفصیلات کا یہ موقع نہیں ہے۔

چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

بانگِ درا میں 'پڑتی ہو' کی جگہ پڑتی ہے' مسلماں کی جگہ مسلمان بالِ جبریل میں غمزہ کی جگہ غمرہ، فقر کی تمامی کی جگہ فقر کی غلامی۔ ضربِ کلیم میں جمال وزیبائی کہ جگہ جمالِ زیبائی، لذتِ تجدید کی جگہ لذتِ تجدیدہ غلط متن ہے۔ اردو کلیات اقبال کی تصحیح کا کام ایک مشاورتی کمیٹی کے سپرد کیا گیا تھا جس میں غلام رسول مہر بھی شامل تھے۔ اس کمیٹی نے بھی بعض فروعی تبدیلیاں کیں۔ جو اقبال کے تیار کردہ ترتیب سے قدرے مختلف تھے۔ ابتدائی اشاعتوں میں اقبال نے بالِ جبریل کی غزلوں اور نظموں کے بعد قطعات بھی بغیر عنوان درج کئے تھے۔ مشاورتی کمیٹی نے رباعیات کا ایک عنوان قائم کر کے سب قطعات کو یکجا کر دیا اور انھیں رباعیات کہا گیا جو خلاف اصول ہے۔ ایسے ہی ضرب کلیم کے سرنامے کی عبارت میں بھی تغیر بہت ہی نامناسب فیصلہ تھا۔

فارسی کلیات کا حال تو اس سے بھی خراب صورت کا حامل ہے۔ رومی کی جگہ روی، خیزد کی جگہ نیزد، فزود کی جگہ فرود، فرسود کی جگہ فرمود، کہستاں کی جگہ قہستاں، درتنم کی جگہ قدتنم، جام آمد کی جگہ جام آورد، کا چھپتے رہنا بڑی اندوہناک صورت ہے۔ بھلا ہو ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کا جنھوں نے بے مثال محنت کر کے ان اغلاط کی نشان دہی کی ہے اور سب کی تفصیلات جمع کردی ہیں۔ (۲۲)

تدوین کی یہ بڑی گمراہ کن صورتِ حال ہے۔ جن سے کلامِ اقبال دوچار ہے منشائے مصنف کے خلاف ترتیب کہاں کی دانائی ہے؟ ''بالِ جبریل'' میں اقبال نے قطعات یا رباعیوں کی جو ترتیب رکھی تھی وہ بدل دی گئی ہے۔ ضربِ کلیم کے سرورق پر جو اشعار اور عبارت تھی وہ بھی حذف کردی گئی ہے۔ میرے پیشِ نظر ''ضربِ کلیم'' کا پہلا ایڈیشن ہے۔ جو کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس، لاہور سے پانچ ہزار کی تعداد میں شائع ہوا تھا (۲۳)۔ ان اشعار اور عبارت کے حذف کیے جانے کا سبب کسی کو نہیں معلوم۔ مرتبین کو یہ حق کہاں سے ملا کہ مصنف کے کلام میں تحریف کی ایسی مذموم صورت قائم کی جائے اور گمراہی کا دروازہ کھول دیا جائے۔ ان خوب صورت اور دیدہ زیب مطبوعات کی عکسی اشاعتیں پاک و ہند میں عام

ہیں۔ بیشتر اشاعتوں میں سرنامہ کی اس اہم ترین تحریر کا تذکرہ نہیں ملتا۔ اقبال کی یہ خاص تکنیک رہی ہے کہ مجموعہ کلام کا آغاز ایک خاص نکتہ سے کرتے ہیں اور قاری سے تشویق وتوجہ کا مطالبہ کرتے ہیں۔ مرتبین نے تحقیق کے مسلمات سے انحراف کر کے اصولِ فن کے ساتھ بدمذاقی کی ہے اور سرمایۂ علمیہ کو شرمسار بھی کیا ہے۔ ''ضربِ کلیم'' کے ابتدائی اشعار وعبارت ملاحظہ ہو:

ضربِ کلیم
یعنی

اعلانِ جنگ دورِ حاضر کے خلاف

نہیں مقام کی خوگر طبیعتِ آزاد
ہوائے سیر مثالِ نسیم پیدا کر
ہزار چشمہ ترے سنگِ راہ سے پھوٹے
خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

علامہ کے کلام کے ساتھ یہ بدمذاقی بڑے سنگین نتائج کا سبب بن سکتی ہے۔ راقم نے عرض کیا ہے کہ وہ صرف شاعر نہیں ہیں۔ جہاں اسالیب واندازِ تحریر پر اکتفا کر لینا ہی مقصودِ متن ہے۔ وہ مفکر بھی ہیں۔ فکرونظر کے اظہار وارتباط کے لئے حرف ومعنی بڑی معنویت رکھتے ہیں۔ ''ضربِ کلیم'' کے ان ابتدائی اشعار کو ہی بہ غور دیکھیں تو اقرار کرنا پڑے گا کہ آخری مصرعہ ایک نادر المثال مفہوم کا حامل ہے۔ جو پورے شعری سرمایہ میں الگ بھی ہے اور انمول بھی۔ یعنی خودی میں محویت کے بغیر ضربِ کلیمی کے معجزات کی نمود ممکن نہیں ہے۔ قاری کو فکر کی اس ارتفاعیت اور ارجمندی سے محروم کر دینا کہاں کی علم پروری یا اقبال دوستی ہے؟ افسوس ہے تحریف اور ترتیب کی اس سنگ دلی پر۔

مصادر

۱۔	تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ	رفیع الدین ہاشمی	لاہور	۱۹۸۲ء ص ۲۲۲
۲۔	نوائے وقت		لاہور	۶ر مئی ۲۰۰۰ء
۳۔	اقبال کے کرم فرما	ماسٹر اختر	نئی دہلی	۱۹۸۹ء
۴۔	اقبال ریویو	لاہور	جنوری	۱۹۷۴ء ص ۴۷
۵۔	کلیاتِ مکاتیبِ اقبال	مظفر حسین برنی	دہلی	۱۹۹۲ء
۶۔	نوادرِ اقبال	عبدالغفار شکیل	علی گڑھ	۱۳۷۷ھ
۷۔	کلیات اقبال	عبدالرزاق حیدر آبادی		۱۹۲۴ء
۸۔	مخزن		لاہور	۱۹۰۳ء
۹۔	اقبال کے ابتدائی افکار	عبدالحق	دہلی	۱۹۶۹ء ص ۲۳۷
۱۰۔	تیر نیم کش (اقبال نمبر)		مرادآباد	اپریل ۱۹۹۶ء
۱۱۔	باقیاتِ اقبال	عبداللہ قریشی	لاہور	۱۹۷۵ء ص ۴۵۵
۱۲۔	کلیات باقیات شعر اقبال	صابر کلوروی	دہلی	۲۰۰۴ء ص ۲۶۹
۱۳۔	اردو غزل کے معروف اشعار کی تحقیق و تصحیح	عائشہ خاتون	حیدرآباد	(غیر مطبوعہ)
۱۴۔	سیارہ		لاہور	۱۹۹۲ء
۱۵۔	اقبال کا ابتدائی کلام	گیان چند جین	حیدرآباد	۱۹۸۸ء
۱۶۔	سرودِ رفتہ	غلام رسول مہر	لاہور	۱۹۵۹ء
۱۷۔	اقبال کا ابتدائی کلام	گیان چند جین	حیدرآباد	۱۹۸۸ء ص ۱۴
۱۸۔	اقبال کا ابتدائی کلام	گیان چند جین	حیدرآباد	۱۹۸۸ء ص ۱۴
۱۹۔	کلیات باقیاتِ شعر اقبال	صابر کلوروی	دہلی	۲۰۰۴ء ص ۴۰۵
۲۰۔	سرودِ رفتہ	غلام رسول مہر	لاہور	۱۹۵۹ء ص ۴۱۔۴۳
۲۱۔	اقبال کے ابتدائی افکار	عبدالحق	دہلی	۱۹۶۹ء ص ۲۴۶
۲۲۔	تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ	رفیع الدین ہاشمی	لاہور	۱۹۸۲ء
۲۳۔	ضربِ کلیم	اقبال	لاہور	(طبع اول)

اقبال اور نقدِ فراقؔ کی نارسائی

فراق بڑی شاعری کے علاوہ تأثراتی تنقید میں بھی معروف مقام رکھتے ہیں۔ وہ تحسین وتنقید سے ہمیں مغلوب کرتے ہیں اور متاثر بھی۔ اقبال کے بارے میں ان کی تحریریں اعتراف اور انحراف دونوں کی حامل ہیں اقبال کی شعری ارتفاعیت کے لئے ان کا قول مشہور ہے کہ ایشیا کے تمام شاعر مل کر بھی اقبال کی اس غزل کا جواب نہیں لکھ سکتے۔

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا

لیکن وہی فراق اقبال کی فرزانگی سے سخت بیزار ہیں۔ ان کے ممدوح مصحفی کا شعر ان کے تلون اور طبیعت کی تصدیق کرتا ہے۔

ساغرِ حسنِ دوست میں بادہ وزہر جمع ہیں
زہر جاں گدازِ قلب، بادہ جاں فزائے ناز

فراق بشری محسوسات کی برگزیدگی کے لئے یاد کئے جائیں گے۔ شعری اظہار میں آدمِ خاکی کے لطیف جمالیاتی احساس اور اس کے مؤثرات کی بعض کیفیات کا ایسا دل نشین اجتماع ماسوائے فراق ہماری روایت میں عمومیت سے خالی ہے۔ غزلیہ شاعری میں یہ مدرکات بے پایاں وسعت رکھتے ہیں۔ اگر ان کوائف کی شیرازہ بندی کی جائے تو نوعِ انسانی کے محسوسات سے ایک عالمِ نو کی نمود ہوسکتی ہے۔ جس میں جذبہ، احساس، تخیل،

تجسس اور تزکیہ ہم آمیز ہو کر اس کھنکتے ہوئے مٹی کے گارے کی تراشیدگی اور تخلیق کا موجب قرار پائے گا۔ شاید انہیں فراواں کیفیات کی وجہ سے بشری تخلیق کو جملہ موجوداتِ عالم پر شرف حاصل ہے۔ فراق اسی سبب فرازِ ادب پر فائز رہیں گے باقی دوسرے پہلو ضمنی اور ذیلی قرار پائیں گے۔

یہ اعتراف ایک عالمی اعلانیہ کی حیثیت رکھتا ہے کہ اردو زبان ہند اسلامی تہذیب کی آمیزش کے طفیل وجود میں آئی۔ ادبی تخلیق و ترسیل میں دونوں ہم شریک رہے ہیں۔ فراق نہ ہوتے تو شاید یہ ادعائیت ایک مفروضہ قرار پاتی۔ کسی غیر مسلم فن کار کو میر وسودا، مومن وغالب، انیس واقبال تو کجا جوش وفیض کے روبرو پیش نہیں کر سکتے۔ نسیم وچکسبت ہمارے لئے بہت محترم ہیں مگر ان صفوں میں اتنے مقتدر نہیں ہیں۔ گویاں فراق نے ہمیں آبرومندی بخشی۔ اس سے زیادہ فکر طلب بلکہ استعجاب انگیز بات یہ ہے کہ فراق اس ذہنی پس ماندگی اور جذباتی درماندگی کے دور کی یادگار ہیں جب اردو سے انحراف ہی نہیں استہزائی تنگ نائی کے ساتھ اسے مسلمانوں سے وابستہ کئے جانے کی ہر امکانی سازش رچی جا رہی تھی۔ ہم فراق کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں اور ان کی تخلیقات کو شہرتِ پروین کے ساتھ آنے والے انسانوں کے لئے شعری آئین کی بشارت سمجھتے ہیں۔

ان معروضات کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ اس اعتراف کا اظہار ضروری تھا کہ اہلِ نظر کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ میں نے ممدوح کے بیانِ وصف میں فراق کو فروتر دکھانے کی دانستہ کوشش کی ہے۔ اردو کی ہیئتِ اجتماعیہ میں میرے نزدیک مذہب و مسلک، نظریہ ونکات یا نام ونسب سب بے معنی ہیں۔ یہ مباحث غیر مستحسن اور مسموم ہیں۔ مسلم اور غیر مسلم کی تفریق بھی قابل نفریں ہے۔ اس طرح کی تقسیم مال ومتاع کے حصول کا مذموم وسیلہ ہے یا افتراق وانتشار سے آلودہ فکر کی کج روی کا حاصل ہے۔ اس زبان کی تکریم کے اقرار کے بعد ہر منفی تصور یا تفریق سے دست بردار ہونا پڑتا ہے۔ لسانی ایقان کی یہ عظمت شاید ہی کسی زبان میں ملے۔ غالباً اسی باعث اردو مذہبی مزاج سے بے نیاز ہے۔ معتقدات پر طنز اور ملامت سب سے زیادہ اردو ہی میں نظر آتی ہے۔ جب کہ وطن عزیز کی دوسری زبانوں میں

ادب مذہبی تخلیقات یا اقدار سے گراں بار ہے۔ اردو نے بنی نوعِ بشر کے احترام کا ایک وسیع تر تصور پیش کیا ہے۔ جس میں فراق کا نام اور ان کی نظر کی تحسین ضروری ہے۔

حیرت ہوتی ہے کہ فضیلتِ آدم اور تحریمِ انسانی کے عظیم داعی اقبال پر فراق کے انتقادی تصورات تعدیل اور توازن سے خالی ہی نہیں تحقیر آمیز ہیں جس میں ان کے ذاتی تصورات، اخذِ نتائج کی عدم صحت، جذباتی مغلوبیت، معاصرانہ چشمک، سیاسی نقطۂ نظر کی تنگ دامانی اور مصلحت کوشی کو دخل ہے۔ اقبال کے فکر و فلسفہ کی اساس اسی انسانی ارتفاعیت پر قائم ہے۔ جس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ اقبال کے شعر و پیغام کا ماحصل اسی احساس کا عرفان ہے جو تسلسل اور تواتر کے ساتھ ان کے کلام میں پیوست ہے۔ احساس کا ایسا دل کش اظہار اور فکر کی ایسی بالیدہ بلندی مفکروں اور ادیبوں کے یہاں ناپیدا ہے:

آدمیت احترامِ آدم است
باخبر شو از مقامِ آدم است

انسانی فکر و نظر میں اس سے بڑی دوسری بات مثال سے محروم ہے۔

برتر از گردوں مقامِ آدمی
اصلِ تہذیب احترامِ آدمی

تفکیری معمولات کو متحرک اور متاثر کرنے والی اس سے بھی کہیں زیادہ گہری اور بے کراں کیفیات کا حامل یہ نکتہ ملاحظہ ہو جو صحفِ سماوی اور اس کے آثار کے علاوہ نایاب ہے۔

گدائے جلوہ رفتی برسرِ طور — کہ جانِ تو ز خود نامحرمے ہست
قدم در جستجوئے آدمے زن — خدا خود در تلاشِ آدمے ہست

بارِ سماعت کے سبب میں وہ خیال قصداً نہیں دہرا رہا ہوں:

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے

یوں بھی بارگاہِ ایزد کے بعد روح الامین کے ذکر کی ضرورت باقی نہیں رہتی انسانیت سے متعلق ایسے عظیم خیالات کسی فنی تخلیق کے محرکات نہ بن سکے۔ خود فراق کی پوری شاعری میں انسانی عظمت کا یہ اعتراف نہیں ملتا۔ دوسرے زاویہ سے بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔

اقبال کے انہیں تصورات کے طفیل دوسرے مذاہب کے احترام اور عظمت کا اظہار ان کی وسعتِ نظر اور کشادہ قلبی کی دلیل ہے۔ انھوں نے ہندو مذاہب اور پیشوایانِ عقائد کو فکر و نظر میں جو مقام دیا ہے وہ بھی کسی اور تخلیق کار کا شیوۂ گفتار نہ بن سکا۔ دانشوری کے کسی مدعی اور گرہ کشایانِ فلسفہ کو بھی اس جرأتِ اظہار کی توفیق نہ مل سکی۔ فراق تو اپنی تمام خودستائی اور ادعائیت کے باوجود بہت پیچھے ہیں۔ اُن کا بیش از بیش اظہار اخلاص کی گرمیٔ احساس سے تہی دامن ہے۔ مگر یہ بوالعجبی بھی خوب ہے کہ اقبال پر ہندو ادیبوں نے بہت زیادہ حملے کیے ہیں۔ جوش ملسیانی، سچدانند، راجندر ناتھ شیدا، کنور کرشن بالی، کرنل بھولا ناتھ، آنند نارائن ملا، حکیم چند نیر، تاراچرن رستوگی، اقبال سنگھ، گیان چند جین، راج بہادر گوڑ کے ساتھ اور بھی کئی نام شامل کیے جاسکتے ہیں۔ اقبال کے ساتھ یہ بدمذاقی بھی خوب ہے کہ فراخیٔ فکر کے باوجود معتوب ٹھہرائے گئے۔ بے مثل ترقی پسند خیالات کے باوجود اس گروہ نے ہی انہیں سب سے زیادہ معتوب قرار دیا۔ ایسے ہی ایک تیسرا گروہ بھی ہے جس نے اقبال کی بے انتہا عقیدت اور افکارِ عالیہ کو پسِ پشت ڈال کر انہیں مطعون ثابت کرنے میں بڑی دل خراش تحریریں پیش کیں۔ مگر ان تمام مزاحمتوں اور نارسیدہ افترا کے باوجود اقبال کے فکر و فن کی ابدی معنویت کم نہ ہوسکی۔ ناقدوں کی پسپائی اور ان کے قلم کے بے توقیری میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ فراق کا رویہ بقول پروفیسر محمد حسن اقبال کی شاعری کے بارے میں سخت اور جارحانہ ہے Adverse and even hostile اور ہر طرح کے انتقادی معائر سے محروم ہے۔ ان کے ادبی اور انبساطی تاثرات بھی عصبیت کی تاریکی میں وقار کھو بیٹھے۔ فراق کی عظمت ان کی تخلیقی توانائی ہے وہ تنقید کے مردِ میدان نہیں رہے۔ ان کی مجبوری تھی کہ وہ ایک استاد بھی تھے مکتب میں شعر کی رسائی اور پھر درس و تدریس میں عیب و ہنر کی مہم جوئی ایک دِراساتی عمل کی حیثیت سے مروّج ہے۔ شاید ان کی تنقید اسی تدریسی منصب کے تابع ہے۔ اور تخلیقی افتاد کے سبب تاثرات کے اظہار پر مائل ہے۔ جسے تاثراتی اور رومانی تنقید کہا گیا ہے۔ یوں بھی اردو کی شعری روایات میں تخلیق کار عام طور پر تنقیدی اعتدال سے عاری ہی نظر آتا ہے۔ خواہ میر ہوں یا محمد حسین آزاد یا فراق۔ اس صف میں فراق کی ایک

انفرادیت ہے کہ شبلی وحالی کے بعد فراق پہلے شاعر ہیں جو تنقیدی مباحث پر مستقل مضامین اور کتابوں کے مالک ہیں۔ ان کے انتقادی رویّوں سے ہر ایک کا ہم خیال ہونا ضروری نہیں ہے۔ ان کے بعض فکری نکات سنجیدہ التفات کا تقاضا کرتے ہیں ''اندازے'' کی وجہ تالیف میں لکھتے ہیں۔

> ''میری غرض وغایت اس کتاب کی تصنیف میں یہ رہی ہے کہ جو جمالیاتی، وجدانی، اضطراری اور مجمل اثرات قدما کے کلام سے میرے کان، دماغ، دل اور شعور کی تہوں میں پڑے ہیں انہیں دوسروں تک اس صورت میں پہنچادوں کہ ان اثرات میں حیات کی حرارت اور تازگی قائم رہے میں اسی کو خلاقانہ تنقید یا زندہ تنقید کہتا ہوں۔ اسی کو تاثرانہ تنقید بھی کہتے ہیں''۔

ان کے تنقیدی تصورات کسی نظام یا نظریہ سے نہ ماخوذ ہیں اور نہ مستعار بلکہ تمام تر شخصی تاثرات کے تابع ہیں۔ ادب کے جمالیاتی اقدار کی بازآفرینی ان کی تفہیم اور تشویق اس طرزِ تنقید کی اپنی شناخت ہے۔ تشویق کا عمل ہی انتقادی اساس ہے اس سے خالی ہر تنقید علمِ نخیل بے رطب کی طرح لایعنی ہے۔ اقبال سب سے مقتدر شاعر ہی نہیں قدرِ اولیٰ کی حیثیت سے ناگزیر اہمیت اور اپنا مقام رکھتے ہیں۔ بڑی بات یہ ہے کہ وہ ہمارے لئے پیمانۂ قدر ہیں۔ بڑے سے بڑا نقاد بھی اقبال پر قلم اٹھا کر اپنے کو بے پردہ کردیتا ہے۔

اقبال سے متعلق فراق کے خیالات ان کے مضامین، بیانات اور بعض تحریروں میں ضمنی طور پر آگئے ہیں۔ جن میں تعریف وتحسین بہت کم اور تنقیص وتضحیک غالب ہے۔ دو مضامین ''آج کل اقبال نمبر'' ''علامہ اقبال سے متعلق خوش فہمیاں ۱۹۷۷ء کا'' اور ''اقبال کی شاعری'' مشمولہ ''باتیں فراق سے'' توجہ طلب ہیں۔ اقبال کے عام معترضین کی طرح وہ بھی اقبال کے شعری اکتسابات کی عظمت کے کسی حد تک قائل ہیں مگر فکر وفلسفہ کی افادیت سے انکار اور اس کی آفاقیت سے وہ خاص طور پر بیزار ہیں۔ اقبال کے دینی عقائد اور اس کے متعلقات سے عام طور پر تمام معترضین تقریباً یکساں خیالات رکھتے

ہیں۔ کہیں کہیں کیفاً یا کمیتاً اور کہیں نوعاً اختلاف ہے مگر اعتراض کی نوعیت ایک جیسی ہے۔ فراق کے تنقیدی آرا وا ہوا بھی عمومیت کے زمرے میں ہی آتے ہیں۔ اندازِ بیان میں شدت اور جذباتی تنفر نے لہجے کو زشت رو بنا دیا ہے۔ فراق کی نثری تحریروں یا گفتگو میں وارد بعض جملے شدتِ تاثر کے حامل ہوتے ہیں اور ان کے لاشعور میں موجود کیفیات کی چغلی کھاتے ہیں۔ اسی لئے کبھی کبھی تمسخر یا تضحیک کا مفہوم نمایاں ہوتا ہے۔ اور جس سے ان کے فکری سرد کار کا پتہ چلتا ہے۔ یہاں تنقید کا ادنیٰ سے ادنیٰ معیار بھی پیشِ نظر نہیں ہوتا اور ان کے تأثرات، تعصبات کی تنگی اور خام فکر کے مظہر بن جاتے ہیں۔ ان کی انتقادی بصیرت مشتبہ ہو جاتی ہے ان کی تنقید اپنے ہی تضادات سے خود کو نقصان پہنچاتی ہے۔ وہ تلسی کی رامائن کے دل سے بڑے مداح ہیں کیوں کہ وہ اعتقادی اقدار سے لبریز ہے۔ مگر اسلامی اقدار کی ترسیل یا ترجمانی سے اقبال کی شاعری قابلِ اعتنا نہیں ٹھہرتی۔ اقبال پر سب سے بڑا اعتراض ان کی ملت پرستی کے سبب ہے۔ شکوہ یہ ہے کہ وہ مسلمان کیوں پیدا ہوئے اور اسلامی افکار سے ان کی نسبت کیوں ہے؟ عالمِ اسلام سے انہیں محبت کیوں ہے؟

> ''اقبال کی شاعری شروع ہی سے ایک ایسی شاندار ذہنیت وشخصیت کا ثبوت دے رہی تھی جسے ہم انگریزی میں Split Personality کہتے ہیں۔ دو حصوں میں منقسم۔ یہ دونوں حصے ایک دوسرے کی ضد تھے اور باہم متناقض، متضاد اور متصادم تھے۔ اس شخصیت کا ایک حصہ ہندوستان پرست تھا اور دوسرا حصہ ملتِ اسلامیہ پرست یا فرقہ پرست''۔

فراق کی مزعومہ تنقیدی نظر اور ان کے فکر و خیال کی ناہمواری انہیں انتقادی انصاف سے محروم کر دیتی ہے۔ انہیں بات بنانے کا ڈھب آتا ہے اور وہ اس کرتب بازی میں اخفائے حقیقت سے بھی گریز نہیں کرتے متون سے حاصل مفاہیم میں تحریف وتصریف ان کا شیوہ ہے جو کسی بھی ناقد کے لئے ناسزاوارِ تحریر ہے۔ انہوں نے اقبال کی شخصیت کو تضاد و تصادم سے تعبیر

کیا ہے۔ کیوں کہ اقبال بیک جنبش قلم ہندوستان کے ساتھ ملتِ اسلامیہ کی توصیف کے بھی قائل ہیں۔ ہندوستان پرستی محمود ہے اور اسلام پرستی عین فرقہ پرستی ہے۔ یہ وہی خیال ہے جو احیائیت پرستوں کی تشدد پرستی یا فاشزم کی فضا میں پروان چڑھا ہے فراق کے خوردونوش کی دنیا بھی انہیں خیالات سے آباد ہے۔ دوسرے لوگوں کی طرح فراق بھی ہندوستانی مسلمانوں کے محسوسات سے دانستہ اغماض برتتے ہیں اقبال کو ہندوستان سے پایانِ عمر تک جو قلبی وفکری تعلق تھا اس کی نظیر فراق کی جملہ تحریروں میں نہیں ملتی۔ ۱۹۳۶ کی نظم ''شعاعِ امید'' کے اشعار کی جاں سوزی اور دل گداز کیفیات فراق کی شاعری میں جنسِ نایاب ہیں۔

خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
چشمِ مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ دُرِ تاب

اقبال نے فلکِ زحل پر ہندوستان اور باشندگانِ ہند کی جو دل دوز تصویر پیش کی ہے۔ فراق کیا ہندوستان کے تمام شاعر مل کر بھی ایسی درمندی کا اظہار نہ کر سکے۔ ''روحِ ہند'' کا ایک منظر ملاحظہ ہو۔

آسماں شق گشت و حورے پاک زاد — پردہ را از چہرۂ برخود کشاد
در جبینش نار و نورِ لایزال — در دو چشمِ او سرورِ لایزال
با چنیں خوبی نصیبش طوق و بند — برلبِ او نالہ ہائے دردمند
گفت رومی روحِ ہنداست این نگر — از فغانش سوزہا اندر جگر

اس تعارف کے بعد روحِ ہند لب کشا ہوتی ہے:

شمعِ جاں افسرد در فانوسِ ہند — ہندیاں بیگانہ از ناموسِ ہند
بندہائے بردست و پائے من ازوست — نالہ ہائے نارسائے من ازوست
کے شب ہندوستاں آید بروز — مرد جعفر زندہ روحِ او ہنوز
ملتے را ہر کجا غارت گرے است — اصل او از صادقے یا جعفرے است

الاماں از روحِ جعفر الاماں
الاماں از جعفرانِ ایں زماں

کیا فراق یا کسی اور شاعر کو یہ ہمت نصیب ہوئی؟۔ کیا ہندوستان سے متعلق کسی نے بھی ایسے وارداتی اشعار کہے۔ برِاعظم کے کسی فن کار کی تخلیق میں یہ کشادگیٔ نظر دکھائی نہیں دیتی کہ وہ دجلہ وفرات پر گنگ وجمن کو قربان کر سکے۔ یہ صرف اقبال کی کائناتی فکر ہے۔ جس میں دریائے کاویری کو جیحوں وفرات سے افضل بتایا گیا ہے۔

اے مرا خوشتر زجیحوں وفرات
اے دکن را آبِ تو آبِ حیات

ہندوستانی ادبیات میں عمومیت کے ساتھ اور فراق کے یہاں تخصیص کے ساتھ کیا اسلامی ثقافت کے آثار وعلائم کا والہانہ تذکرہ ملتا ہے؟۔ جواب نفی میں ہوتو آپ متعجب نہ ہوں۔ کونین کی سب سے منزہ ذات پیغمبر اعظم وآخرؐ پر فراق نے کوئی تخلیق پیش نہیں کی۔ وہ نظمیں بھی کہتے رہے جن کے اشعار کی تعداد تقریباً چار ہزار ہوتی ہے۔ مگر ایک نظم بھی اس موضوع پر نہیں ملتی۔ اقبال نے رام، گرونانک، گوتم بدھ، وشوامتر کا ذکر کیا ہے۔ یہی نہیں فلک قمر پر طاسین محمدؐ سے پہلے طاسین گوتم اور عارفِ ہندی کا عقیدت مندانہ تخلیقی اظہار موجود ہے۔ ان حقایق کے بعد اقبال کو فرقہ پرست کہنے والوں کے دلوں میں کھوٹ ہے۔ اور عناد بھی۔ کیوں کہ ان کی موجودگی میں نقد ونظر کے اقدار سلب ہو جاتے ہیں۔ فراق کی تنقید اقبال کے شعر وپیغام کو نقصان نہ پہنچا سکی۔ مگر ان کی ذہنیت اور اندرونِ دل میں پناہ گزیں نفرتیں آشکار ہو گئیں۔ جو ان کے لئے زیاں کار ثابت ہوئیں۔

ان دونوں مضامین کی اشاعت وترقیم میں زمان ومکان کے بُعد حائل ہیں۔ مگر حیرت کی حد تک دونوں کے موضوعات ومباحث ایک ہی ہیں بلکہ متعدد جملے وحوالے یکساں ہیں۔ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ فراق نے ان جملوں میں درپیش پہلوؤں کو دانستہ طور پر موزوں کیا ہے۔ یہ لمحاتی تاثرات نہیں ہیں بلکہ ان کے نکتہ ہائے نظر کے ترجمان ہیں۔ اور یہ ان کے پختہ تصورات ہیں۔ جن میں اقبال کی مخاصمت سرِعنوان ہے۔ اقبال پر ان کے

اعتراضات ناقدین اقبال سے ہی مستعار ہیں اور بار بار انہیں کا اعادہ کیا گیا ہے۔ جن میں ان کی اسلامیات، مردِ مومن، خودی و بیخودی، ہندوستان سے بیزاری، مسلم لیگ کی حمایت، شاہینیت وغیرہ۔ مگر فراق نے اس انتقادی گفتگو کے سہارے دل میں چھپے مکروہ خیالات کو لہجے اور اندازِ بیان کی کرختگی سے انفرادی بنا دیا ہے۔ مجنوں گورکھپوری کا حوالہ بھی ملتا ہے۔ فراق کی یہ تنقید ان کے انتقادی ادب میں اس لئے بھی اہمیت رکھتی ہے کہ ان مضامین میں ان کے معتقدات ہیجانی تشدد کے ساتھ بے نقاب اور ان کی فطرت و کیفیت کے بہت سے دبیز پردوں کو چاک کر کے نمایاں ہو گئے ہیں۔ یہاں فراق کی اصل شبیہ سامنے آتی ہے۔ اور بہت سے وسوسوں کو دور کرنے میں معاون ہوتی ہے۔ پایان کار وہ اپنے دھرم اور عقیدہ کو راہِ نجات، سب سے برتر اور عالمی مسائل کا واحد حل قرار دیتے ہیں۔ پنڈت نہرو کے حوالے سے لکھا ہے کہ ہندو فکریات کی عظمت عالم گیر انسانیت دوست ہیں۔ اور انہیں تصورات پر اقوام متحدہ کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اقبال کی ملت زدگی کو جنوں قرار دیا ہے۔

''دنیا بھر میں صرف ہندو مذہب ایک ایسا مذہب ہے جو ان اخلاقی اچھائیوں کو انسان کے اچھے اور برے ہونے کی کسوٹی بناتا ہے۔ یہ بھی ہندو مذہب کی عالم گیر فتح ہے''۔

''عالم گیریت تو ہندو مذہب کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے''۔

ایک مخصوص مذہبی فکر کو عظیم سمجھنے کا جواز بن سکتا ہے۔ مگر دوسرے عقیدوں کی غلط اور گمراہ کن تعبیر بددیانتی کہلاتی ہے۔ مثلاً

''رہی بات توحید کی۔ جس طرح اس لفظ کا بہانہ بنا کر تلواریں اٹھائی گئیں ہیں اور جس طرح اس لفظ کا ٹھیکہ زبردستی مسلمانوں نے لے رکھا ہے اس سے ہندوؤں کو سخت نفرت رہی ہے''۔

ایک آخری فیصلہ

''وہ تمام مذاہب مٹ جائیں گے جو اپنے سے مختلف عقیدہ رکھنے والوں کو جہنمی سمجھتے ہیں۔ یہ تعلیم سب سے پہلے دنیا کو صرف ہندو مذہب نے دی جو عام ہو کر عالم گیر انسانیت کا ورثہ بن جائے گی''۔

عقائد سے قطعِ نظر اقبال کی اساسی فکر اور ارکان کی جس طرح فراق نے تقلیب یا تحریف کی ہے اس کی مثال نہ ان کی تحریر میں ملتی ہے اور نہ کہیں اور۔ یہ تو تنقید پر بہتان اور اس کے اقدار کی اہانت ہے انہیں تنقیدی افترا اور تاثراتی کذب کا حق حاصل ہے۔ کیوں کہ وہ بڑے شاعر ہیں اور اپنے سے کئی گنا بڑے شاعر کی عظمت کے سامنے سرنگونی اور بے مائیگی کے احساس کو مٹانے کے لئے یہ رکیک سہارے لئے گئے۔ وہ اقبال کا کچھ نہ بگاڑ سکے مگر خود کو بے توقیر کرلیا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقبال کی عظمت کا بوس بن کر انہیں اکثر ستاتی ہے۔ وہ غیر متعلق گفتگو میں بھی اقبال کو کھینچ لاتے ہیں۔ جیسے اس کتاب میں گفتگو غالب پر ہے۔ مگر اقبال ان کا پیچھا نہیں چھوڑے۔

''یہ سوال ہمیشہ ہمارے سامنے رہے گا کہ ترمانِ حقیقت اقبال نے ایسی کن حقیقتوں کی ترجمانی کی جن پر میر غالب یا ٹیگور کی نگاہیں نہیں پڑی تھیں۔ کیا اقبال وجود کا تصور رکھتے تھے وہ میر و غالب کے تصور وجود سے زیادہ گہرا یا زیادہ بلند ہے کیا ان کی مسجد قرطبہ میر و غالب کی مسجد کائنات سے بڑی ہے''۔

اسی طرح ''اتحاد اور قومی یک جہتی'' کے عنوان کے تحت مضمون میں بھی اقبال در آتے ہیں۔ اور فراق اپنی پوری ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''جہاں تک اردو زبان و ادب کا تعلق ہے۔ ہمیں مغرب یا غیر مسلم قوموں کے خلاف اور زہریلے غم وغصہ سے بچنا ہے جس کی قابلِ افسوس مثالیں اقبال کی شاعری میں ملتی ہیں''۔

فراق جوش کی عظمت اور شہرت کی وجہ سے بھی اندیشہ ہائے محرومی میں مبتلا تھے۔ جوش کو ایک تاکیدی اور قدرے تفصیلی خط لکھا تھا جس میں اقبال کا ذکر بھی بر سبیل تذکرہ نہیں بلکہ دانستہ طور پر کیا ہے۔ جو کسی حد تک ستائشی ہے کیوں کہ یہ خط پاکستان میں شائع ہونا تھا وہاں کے قارئین کی خفگی فراق کی مصلحت کوش شخصیت کے منافی تھی۔ انہیں سود و سود امکر و فن کا ہنر خوب آتا تھا وہ پوری زندگی اس کا جتن کرتے رہے۔

''یہ تمہاری غلطی تھی کہ پاکستان میں رہ کر اقبال کی مخالفت دانش مندی نہیں اور صحیح بات تو یہ ہے کہ تم اقبال کو سمجھ بھی نہیں سکتے کیوں کہ اقبال نے دین اسلام کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اس کی افادیت میں اعلیٰ پیمانے کی گہر افشانی کی ہے ان کا علم اس معاملہ میں مکمل ہے تمہارا علم ان کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ تم دین سے واقف ہی نہیں۔۔۔۔۔ میں نے جو اقبال پر اعتراض کئے ہیں ان کی نوعیت الگ ہے۔ یعنی وہ ملت کی شاعری اگر نہ کرتے تو عظیم شاعر ہوتے''۔

یہ خط ۲ رجنوری ۱۹۷۵ء کا لکھا ہوا ہے۔ (لٹریری نیوز لاہور۔ پیش رفت دہلی راکتوبر ۱۹۹۸ء) پیشِ نظر مضمون میں فراق نے اقبال کو بہانہ بنا کر اسلام اور ہندوستانی مسلمانوں کے بارے میں اپنی سخت گیر اور متشدد درویوں کو بڑی سفاکی سے قلم بند کیا ہے۔ جس کا ماحصل یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمان گمراہ ہے، مسلم لیگی ہے، جناح پرست ہے، سچائیوں سے اعراض برتنے اور بہتان طرازی میں حافظہ بھی ساتھ نہیں دیتا۔ سچی صورتیں تنسیخی عمل سے زِشت رو بنائی جاتی ہیں۔ استنباط کے لئے فکر ونظر کی سالمیت اور بالیدگی درکار ہوتی ہے۔ پراگندہ خیالی گمراہی کا سبب بن جاتی ہے۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو'

''اب اقبال کی شاعری موجودہ صدی کی تیسری اور چوتھی دہائیوں میں قدم رکھتی ہے۔ ہندوستان کی نشاۃ ثانیہ کا آفتابِ نصف النہار اس زمانہ میں بہت بلند ہو چکا ہے اور اس نئی بیداری سے اقبال بیک وقت متاثر بھی ہیں اور خائف بھی۔ بلکہ لرزہ براندام بھی۔۔۔۔ وطن پرست اقبال کا اس زمانہ میں انتقال ہو چکا ہے اور اقبال اپنے ہاتھوں اسے دفنا چکے ہیں۔ اسی دوران اپنی ملت پرستی کے جواز میں اقبال نے فلسفۂ خودی اور بیخودی کا ایک ایجاد بندہ قسم کا آڈمبر رچا''۔

تیسری اور چوتھی دہائی کا مطلب ۱۹۲۱ء سے تاحیات کا وقفہ شمار کیا جائے گا اقبال وطن پرستی کے پرفریب مغربی تصور کو ۱۹۰۸ء میں ہی خیر باد کہہ چکے تھے۔ نظم وطنیت بارِ ثبوت

کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

خودی اور بیخودی تیسری دہائی نہیں دوسری دہائی کی دین ہیں۔ فراق کو تسامح ہوا ہے۔ یہ ایجاد بندہ نہیں مدتوں کی گہری سوچ اور عبقری ذہن کی تخلیق ہے۔ غلام اور مغلوب قوم کی نفسیات میں آتش و آہن کی طمازت اور تحریک جنم دینے کے لئے اس فلسفہ کو وجود بخشا گیا۔ اس راز کو پانے کے لئے اس صالح فکر کی ضرورت ہے جو شرر سے شعلے تک رسائی حاصل کرتی ہے۔ اس رسائی کے لئے نہ فراق کو مقدور ملا ہے اور نہ اس قبیل کے دیگر نقاد ہی سچائیوں کی شناوری کر سکے۔ جوش کے نام اسی خط کے آخری پیراگراف کا ایک جملہ خود ان پر بھی صادق آتا ہے۔

''تم اقبال کو برا کہہ کر اقبال سے بلند ہونے کی کوشش نہ کرو''۔

فراق نے اقبال پر کچھ سوالات قائم کیے ہیں۔ جن کے جواب فراق کی تحریر سے پہلے دیئے جا چکے ہیں۔ انہیں وہ قصداً اور اراداتاً تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں اور نہ ہی ان کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ چوتھا سوال مرد مومن کا ہے جو ان کے بقول اپنی شاعری کے نشے میں شرابور ہو کر عالمِ حال و قال میں ایک بے بنیاد تصور کو پیش کیا ہے۔

نگاہِ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

فراق کا باطن بھڑک اٹھتا ہے۔ وہ پوچھتے ہیں اقبال کسے مردِ مومن ٹھہرائیں گے سر سید کو، اپنے آپ کو، مسلم لیگ کے لیڈروں کو، قائداعظم کو، مہاتما گاندھی کو، پنڈت نہرو کو یا کس کو؟ اقبال کے اس تصور کو فراق اپنی تنگ نظری کے سبب سمجھنے سے قاصر رہے۔ شاید انہیں نہیں معلوم کہ اقبال نہ اتنے کم نظر تھے اور نہ اتنے بے خبر کہ اس آفاقی سچائی سے گریز پائی کرتے اور اپنے نظامِ فکر کو نا تمام چھوڑ دیتے اور اتنے بڑے غیر اسلامی کرۂ ارض کو انسان کامل کے وجود اور اس کے فیضان سے محروم کر دیتے۔ اپنی یادداشت کو محفوظ تر بنانے کے لئے کلام اقبال سے ان کی فکری باز آفرینی کا سب سے اہم نکتہ پیش کرنا چاہوں گا جسے نظر

انداز کر کے ایک بڑی اندوہناک غلط فہمی اور گمراہی پھیلائی گئی ہے۔ یہ خیال ایک مقام پر بڑی وضاحت سے پیش کیا گیا ہے۔ ان کے نزدیک مردِ مومن سے کوئی معاشرہ خالی نہیں ہے۔ اس کی اطاعت بدونِ تفریقِ ملل و مذہب سب پر واجب ہے۔ ہاں وہ انسانِ کامل اپنی ذات وصفات میں وہبی و کسبی حسنات سے متصف ہوگا۔ جاوید نامہ کی آخری سیاحت ''آں سوئے افلاک'' ہے۔ شاعرِ ہند برتری ہری سے قبل شاہ ہمدان سے ملاقات اور استفسار کا یہ حصہ ملاحظہ ہو کہ آپ نے تو اچھے برے بہت سے نکات بیان فرمائے ایک دوسرے مسئلے پر بھی اظہار خیال فرمائیں کیونکہ آپ کی نظر میں تقدیرِ عالم بے حجاب ہے۔

مرشدِ معنی نگاہاں بودۂ   واقفِ اسرارِ شاہاں بودۂ
ما فقیر و حکمراں خواہد خراج   چیست اصلِ اعتبارِ تخت و تاج

شاہِ ہمدان جواب دیتے ہیں:

فاش گویم با تو اے والا مقام   باج را جز با دو کس دادن حرام
یا اولی الامرے کہ منکم شانِ اوست   آیۂ حق حجت و برہانِ اوست
یا جواں مردے چو صرصر تند خیز   شہر گیر و خویش باز اندر ستیز
روزِ کیں کشور کشا از قاہری   روزِ صلح از شیوہ ہائے دلبری

یہاں سرسید اور قائد اعظم کے ساتھ گاندھی جی اور پنڈت نہرو سب کی گنجائش ہے۔ یہ صرف فراق کا سہو نہیں ہے۔ بلکہ ان تمام سخت گیر ناقدین نے کتمانِ حق کر کے متون کی غلط اور گمراہ کن تاویلات کے ذریعہ اقبال کو مسمار کرنا چاہا۔ ان کی تنقیدی آرا کا وزن و وقار جاتا رہا۔ بیش و کم یہی صورت فراق کی بھی ہے۔ ذوق و مصحفی اور عشقیہ شاعری پر فراق کی انتقادی اہمیت کے اقرار و اعتراف کا دائرہ کم نہ ہوگا۔ مگر اقبال پر ان کی تنقید ایک بہت ہی محدود فکر کی واہمہ کہلائے گی جو نقائص کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہے۔ فکر و فن کی خامیاں تلاش کر کے مطمئن ہو جانا انتقاد ہے اور نہ انصاف۔ فکر کی تحریم اور قلم کی تکریم کے بغیر تنقید و تأثر پر فریب سراب سے بھی زیادہ مسموم مؤثرات کے حامل ہوتے ہیں۔ فراق کی فہم و فراست تنگیٔ داماں میں اسیر ہے۔ فکر شاعر کی پنہائیوں پر کمند ڈالنے کے لئے عالمِ نو گر دانائے راز کے وجود و نمود کی منتظر ہے۔

کرتا ہے ترا جوشِ جنوں تیری قبا چاک

(آزاد کی اقبال شناسی)

دنیا کے کئی دانشوروں کی طرح اقبال بھی محرومیوں سے دو چار رہے۔ اگرچہ اقبال کی محرومیوں کی نوعیت مختلف ہے۔ آرزومندی اوراس کی دریابی ان کے تصورات کا ایک اہم پہلو ہے۔ بہتر سے بہتر صورت گری کے لئے وہ ہمیشہ کوشاں رہے۔ کچھ حاصل بھی ہوئے۔ مگر زیادہ تر تشنۂ تکمیل اور حرفِ تمنا ہی بنی رہے۔ ان کی ناکامیوں کی عبرت ناک فہرست ہے۔ ہر سنجیدہ قاری محسوس کرتا ہے کہ ان کی نارسائیاں کہیں کہیں نالۂ دل دوز بن کر دبیز پردوں کو چاک کرتی ہیں۔ ان کی شخصیت کا یہ تضاد بھی کم حیرت خیز نہیں ہے کہ ان کے درونِ دل میں ایک پیہم اضطراب اور ناآسودگی نظر آتی ہے۔ جو ذاتی کم اور اجتماعی بے حسی کی بدولت زیادہ ہے۔ دوسری طرف بیرونی سطح پر افکار و اظہار میں بلا کی توانائی اور طرب ناکی عزم و جلال سے معمور ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ ان کے محبّ اور مخاطب دونوں نے ملکر ان کی مایوسیوں میں اضافے کئے ہیں۔ حینِ حیات سے ہی یہ سلسلہ شروع ہوا۔ سرعبدالقادر اقبال کی تحسین میں ''بانگِ درا'' کی تقریظ میں حلول اور تناسخ تک پہنچے۔ اقبال کی نظر میں وہ بڑے محترم تھے۔ ان سے اپنے پہلے اُردو شعری مجموعے کا مقدمہ لکھوایا۔ بعدازاں اقبال کی مقبولیت سے وہ اتنے خائف ہوئے کہ ان کی ترقی میں حارج ہوئے۔ کئی دوسرے

دوستوں کا بھی یہی حال ہے۔ یہ معاصر دوستوں کی بات تھی۔ اب ذرا مخاطبین کو ملاحظہ فرمائیں۔ اقبال کے مطالعہ میں فرقوں یا عقیدوں کے نام ونسب کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ وہ اخوت ومساوات پر قائم بنی نوعِ بشر کا ایک عالم گیر تصور رکھتے ہیں۔ دنیائے ادب میں اس تصور پر اس شدت سے فکری بنیادیں فراہم کرنے والا دوسرا فن کار نظر نہیں آتا۔ برِّ صغیر کے اقوام یعنی ہندو مسلمان ان کے مخاطبِ اول تھے۔ اسلامی سیاق وثقافت ان کی فکر اور شاعری کا نقطۂ پرکارِ حق ہے۔ مسلمانوں کے معاملات ومسائل پر ان کی خاص توجہ ہے۔ اس گروہ نے اقبال کو سب سے زیادہ مایوس کیا اور ان کو خلش میں مبتلا رکھا۔ جب کہ اقبال زندگی بھر ان کے سوز وساز میں شریک رہے۔ انھوں نے اقبال کو ہدفِ تنقید بنایا۔ سنّیوں نے تفضیلی کہا کفر کا فتویٰ صادر کیا اور اقبال کے خلاف شرمناک تحریریں شائع کیں۔ ذاتیات پر رکیک حملے کیے اور محاذ آرائی بھی کی۔ ثبوت کے طور پر ڈاکٹر ایوب صابر کی کتاب ''اقبال دشمنی'' دیکھی جاسکتی ہے۔ اقبال نے اہلِ بیتؓ کے حضور جن انقلاب آفرین عقیدت کا اظہار کیا ہے وہ ان کے افکار کا لازوال سرمایۂ احترام ہے۔ کوئی مورخ اور مرثیہ نگار اس منزلت تک رسائی حاصل نہ کرسکا۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ اس طبقے کے ادیب ودانشور اور ناقدین نے اقبال پر زیادہ سے زیادہ ملامتی رویہ اپنایا۔ ایک دو استثنائی صورت کے علاوہ اس گروہ نے اقبال کو قابلِ اعتنا ہی نہیں سمجھا ہاں حال ہی میں ڈاکٹر اکبر حیدری نے ایک کتاب پیش کر کے اقبال کے ساتھ ان کے استاذ مولانا میر حسن کو بھی تفضیلی ہی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ غالب کے بعد اقبال کی تطہیر ہونی ہی چاہیے تھی۔ جس نے بھی تصنیف پیش کی وہ مخالفانہ اور معاندانہ ہی رہی۔ اسی ذیل میں ترقی پسند ادیب وناقد بھی شامل ہیں۔ ترقی پسندی کی آڑ میں اقبال کے خلاف دل کا سارا بخار نکالا گیا۔ اس میں تفضیلی طبقے کے لوگ پیش پیش رہے۔ انہیں شاید اس حقیقت کا ادراک نہ تھا کہ زمانے نے اس نظریہ اور نہاد کو خس وخاشاک کی طرح اڑا دیا۔ دوسری حقیقت بھی دیکھیے کہ اقبال نے جن ترقی پسندانہ خیالات کا اظہار کیا ہے وہ مارکس اور لینن کے حامی وحمایتی مل کر بھی پیش نہ کرسکے۔

اب ذرا ہندوؤں پر نظر ڈالیے۔ اقبال نے اس عقیدے کے رہنماؤں اور رشیوں نیز

فلسفہ وفکر سے جس وابستگی کا اظہار کیا ہے کیا وہ اُردو، فارسی اور انگریزی کے کسی شاعر و دانشور کے احاطۂ تحریر میں موجود ہے؟ اس حقیقت کے باوجود غیر مسلم مصنّفین نے اقبال کو نہیں بخشا۔ ان کی تمام و کمال تحریریں اقبال کے خلاف ہی ملیں گی۔ حد یہ ہے کہ ملک راج آنند ہوں یا آنند نرائن ملا یا اُردو کے معروف شاعر فراق اور محقق پروفیسر گیان چند جین، جنہیں اقبال کی حجازی لے پسند نہیں ہے۔ ہاں چند نام ایسے ہیں جنہیں مخالفین کے زمرے میں نہیں رکھا جا سکتا۔ اس تکلیف دہ تمہید کے پس منظر میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی خدمات کا صدقِ دل سے معترف ہوں۔ وہ صفِ اول کے اقبال شناسوں میں ہرگز شامل نہیں ہیں۔ اور نہ ان کی اقبال شناسی اقبال کے فکر و فن کی تفہیم میں کوئی اضافی حیثیت رکھتی ہے۔ مگر اقبال کو مقبولِ عام بنانے میں ان کی تصانیف نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔ اقبال کے خیالات کی ترجمانی و تشریح میں انھیں یاد کیا جائے گا۔ ان کی اہم کتاب ''اقبال اور مغربی مفکرین'' ہے۔ یہ بھی ایک سرسری اور عمومی تقابل و تجزیہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ ظاہر ہے کہ آزاد کا نہ تفکیری مزاج تھا اور نہ مطالعہ۔ وہ شاعر تھے اور زماں و مکاں کے پردۂ ساز کے پروردہ بھی۔ وہ مقدور بھر ہر مقام اور ہر لمحے کا احتساب اور منافع حاصل کرنے کا سلیقہ رکھتے تھے۔ مشاعرے ہوں یا مذاکرے مال و متاع کی دنیائے دوں آباد رہتی اور اس کے لئے وہ سو سو جتن بھی کرتے تھے۔ جس کا لازمی نتیجہ تھا کہ وہ نہ شاعری میں مقام حاصل کر سکے اور نہ انتقادی ادب میں جگہ پیدا کر سکے۔ یوں بھی زمانہ ساز شاعر معتبر نقاد نہیں بن سکتا اقبال شناس بننے کے لئے شاعری کو غرقِ مئے ناب کرنا پڑے گا۔ مقتدر اقبال شناسوں کی تحریریں یہی ثابت کرتی ہیں۔ راقم کا یہ خیال ہے کہ انھوں نے مصلحتوں اور مجبوریوں کی بناء پر اقبال شناسی کے کوچے میں قدم رکھا تھا۔ یہ بات بھی حیرت ناک ہے کہ اقبال کے معتقد ہونے کے باوجود ان کی شاعری اقبال کے اسلوب و آہنگ سے خالی ہے۔ فیض کو اقبال سے ایک ذہنی وفکری تعلق تھا ان کی شعری تخلیقات میں اقبال کا پرتو اور پرچھائیں نظر آتی ہیں۔ سردار جعفری اقبال کے بہت حد تک معترف تھے۔ ان کی شاعری میں اقبال کے اثرات بہت نمایاں ہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ پروفیسر موصوف کے رگ و پے میں اقبال کا خروشِ احساس

رواں نہ تھا۔ان کی عقیدت محض تحریر وتقریر تک محدود تھی۔

اس کی دوسری مثالیں بھی ہیں۔انھوں نے جوش کے حوالے سے اپنے دل کی بھڑاس نکالی ہے۔جوش ملیح آبادی اقبال سے کدورت رکھتے تھے۔یہ وہی جوش ہیں جن کے لئے اقبال نے سفارشی خط لکھا تھا اور ان کی تعریف کی تھی۔"آج کل" کی ادارت کے زمانے میں جوش و آزاد بہت قریب تھے۔بلکہ رفیقِ کار کی حیثیت رکھتے تھے۔آزاد نے جوش کے انتقال کے بعد اپنی تحریروں میں ان کا اکثر مذاق اڑایا ہے اور اقبال کے بارے میں جوش کے ایسے مکروہ بیانات مندرج کئے ہیں کہ خود راوی کی نیت مشتبہ نظر آتی ہے۔ملاحظہ ہو اقبال انسٹی ٹیوٹ سری نگر سے شائع شدہ کتابچہ "اقبال ۵، ۱۹۹۸ء۔" مجھے حیرت ہے کہ ایسا رکیک مضمون مرحوم پروفیسر اندرابی نے کیوں شائع کیا؟ وہ بھی اقبال انسٹی ٹیوٹ سے اور بہ حیثیت ڈائریکٹر و مدیر کے۔اگر جوش کا بیان صحیح بھی ہو تو یہ نقلِ کفر بھی ارتکابِ جرم ہے۔

پروفیسر آزاد کی اقبالیات کی طرف مراجعت بہت سوچے سمجھے منصوبے کا نتیجہ ہے۔ہم سب کی طرح ان کی بھی بشری کمزوری تھی۔جس میں چند معزز ہستیوں کے مناسبات کے سہارے اپنے قد و قامت کو بلندی بخشنے کی سعی کی جاتی ہے۔غالب و اقبال برّصغیر کے دو عظیم فن کار ہیں۔غالبیات کا دامن مالک رام تھام چکے تھے۔اب اقبالیات کی باری تھی۔ادبی دنیا حریفِ مئے مردِ افگن اقبال کی صدا دے رہی تھی۔یہ بات بھی کم دلچسپ نہیں ہے کہ کشمیر جانے سے پہلے آزاد کی توجہ اقبال پر برائے نام تھی۔کشمیر میں مرکزی حکومت کی طرف سے رابطۂ عام کے منصب پر فائز کئے گئے۔یہاں عوام و خاص میں اقبال کی مقبولیت ایک جذباتی وابستگی کا درجہ رکھتی ہے اور شیخ عبداللہ مرحوم کی اقبال سے والہانہ شیفتگی بھی ایک حقیقت ہے۔ملک کے سربراہ اور عوام کے محسوسات کی نبض شناسی مرکزی حکومت کے لئے بڑی معنویت رکھتی ہے۔مرکز اور ریاست کے درمیان رابطے کی استواری کے لئے بھی آزاد کا انتخاب یا استصواب ناگزیر تھا۔دھیرے دھیرے وہ شیخ صاحب سے قریب تر ہوتے گئے۔بہ ظاہر اقبال ایک بہانہ بنے۔پھر شیخ صاحب بھی آئینۂ آزاد میں اس طرح اترے کہ

آزاد کو مرحمتِ خسروانہ سے سرفراز کیا۔ تاحیات تنخواہ اور تمام مراعات کے ساتھ پروفیسر ایمرٹس کا منصب تفویض کیا جانا بھی علمی وادبی تاریخ کا اعجوبہ ہے۔

اس اعزاز کی برکت سے فیضانِ سماوی کا نزول شروع ہوا۔ یونیورسٹیوں میں اُردو کی اسامیوں کی بھرتی کے لئے وہ کارشناس قرار دئے جانے لگے۔ مشاعرے اور مذاکرے کی محفلوں میں توسیع ہوئی تقررات اور اہم فیصلہ کن کمیٹیوں میں شمولیت کا دائرہ کار بڑھا۔ پھر اقبال اور اقبالیات پسِ پشت پڑ گئے اور آزاد کے اقرار واعتراف کے لئے امکانی حد تک کوشش کی جانے لگی۔ آزاد کی خودی بلند سے بلند تر ہوتی گئی اور ان کے رازِ درونِ سینہ کی غماز بن گئی۔ خودشناسی اور خودستائی نے واحد متکلم کے طرزِ بیان کو اپنالیا۔ ہر بات میں اپنی یافت اور فتوحات کا تذکرہ شعارِ زندگی بنتا گیا۔ چنانچہ آمادہ کرکے اور امداد فراہم کرکے اپنی ذات وصفات پر کتابیں لکھوانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اُردو میں یہ مذموم بدعت غالباً انھیں کی ذات سے اپنی ابتدائی نسبت رکھتی ہے۔ اپنے ساتھ اپنے والدِ محترم کو بھی زندۂ جاوید بنانے میں ان کی جدوجہد جاری رہی۔ جواز بھی تھا کہ کسی لایق فرزند کی یہی پہچان بھی ہے۔ انھیں مقدرت ملی تھی اور خوش قسمت بھی تھے کہ ایک فن کار باپ کے سپوت تھے۔ تلوک چند محروم اقبال کے قدرشناسوں میں نہ تھے۔ اور نہ ان کے معاصر جوش ملسیانی۔ جوش تو اقبال کی خامیوں پر کتاب بھی لکھ چکے تھے۔ ان کے بیٹے عرش ملسیانی بہت ہی باغ وبہار انسان تھے۔ اکثر صبح کے وقت چہل قدمی کے بعد پڑاؤ کے طور پر میری قیام گاہ ماڈل ٹاؤن میں تشریف لاتے اور کبھی کبھی اقبال پر طنز وتمسخر سے کام لیتے۔ اس میں شدت نہ ہوتی مزاح اور ٹھٹھول کا پہلو غالب ہوتا۔ راقم ان کا پڑوسی تھا۔ روزانہ ملاقات کا سلسلہ رہتا۔ پنجاب کی ادبی محفلوں کا ذکر ہوتا۔ ان کی نظر میں بھی آزاد کی اقبال شناسی معتبر نہ تھی اور نہ ہی ان کی شاعری۔ ان کے اندازِ ترنم پر عرش صاحب خوب مزہ لیتے اور نقلیں بھی اتارتے۔ خود اپنا کلام ترنم سے پڑھتے۔ مولانا گرامی کا نام بڑے احترام سے لیتے۔ انھوں نے اپنے نعتیہ مجموعے کے سرورق پر مولانا گرامی کے بے مثل شعر نقل کرکے اپنے جذبۂ احترام کو تابندگی بخشی ہے۔ یہ سلسلہ کئی برس قائم رہا۔ وہ بھی جوش ملیح آبادی کے ساتھ رہ چکے تھے۔ مگر انھوں

نے کبھی اقبال کے بارے میں جوش کے ناپسندیدہ بیانات کا ذکر نہیں کیا۔ جبکہ آزاد نے بڑی فراخی کے ساتھ قلم بند کیئے ہیں۔ جس سے محسوس ہوتا ہے کہ اقبال و جوش کے درمیان مغائرت پیدا کرنے کی یہ ایک شعوری کوشش ہے۔ انھوں نے اقبال کے بارے میں جوش کے خراجِ عقیدت کے اشعار بھی بھلا دیے۔ ان کے ساتھی میرے اچھے دوست ڈاکٹر شیام لال کالرا بھی آزاد کی اقبال شناسی کے معترف نہ تھے۔ وہ اکثر شاکی رہتے۔

ایک دوسرا پہلو بھی قابلِ ذکر ہے۔ آزادی کے بعد اُردو پر جو افتاد پڑی تھی وہ بہت ہی دل دوز کہانی ہے۔ اُردو کو مشترک زبان کی حیثیت سے تسلیم کیئے جانے پر توجہ وقت کا تقاضا تھا۔ اس تصور اور تحریک میں ہندو مسلمان کے اشتراکِ عمل کی بڑی ضرورت تھی۔ بعض تفریق پسند طاقتوں کے سازشی منصوبوں کا جواب بھی اسی میں تھا۔ لہٰذا غیر مسلموں کی شرکت و سربراہی کو ناگزیر سمجھ کر انہیں مناسب توقیر دی گئی۔ ملا صاحب کو عزت بخشی گئی۔ مالک رام صاحب کی منزلت اتنی تھی کہ وہ اُردو و فارسی کے معاملات میں دخیل تھے۔ سفارت خانۂ ایران میں مالک رام صاحب کی بازیابی کی وجہ سے دوسرے فارسی داں ان کی خوش آمد کے لئے مجبور تھے۔ چنانچہ اسی ضد میں ''اُردو تحقیق اور مالک رام'' کتاب بھی شائع کی گئی۔ جس کا انھیں بڑا املال تھا۔ ۱۹۶۹ء میں غالب کا صد سالہ جشن منایا گیا جس میں موصوف پیش پیش تھے۔ حالانکہ یہ خیال اور منصوبہ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی مرحوم کا تھا۔ لیکن احباب نے مل ملا کر فخر الدین علی احمد کی سرپرستی میں جشن کا اہتمام کیا اور فاروقی صاحب کو الگ کر دیا گیا۔ مالک رام غالب کے جشن سے فارغ ہوئے تھے کہ ۱۹۷۳ء میں اقبال کے صد سالہ جشن کی تیاری شروع کر دی۔ راقم نے ''اسٹیٹس مین'' میں ایک خط شائع کرایا کہ اقبال کی تاریخِ ولادت متنازع فیہ ہے۔ بیشتر دستاویزات ۱۸۷۷ء کی تائید کرتے ہیں۔ مالک رام صاحب چاہتے ہیں کہ جلد از جلد شہرت و سیم کی دولتِ بیدار سمیٹ لیں۔ اس خط کی اشاعت پر انھوں نے مجھے سخت دھمکی دی اور ہتک عزت کا مقدمہ دائر کرنے کی بات کہی۔ خاکسار نے بصد ادب عرض کیا کہ آپ کو اختیار ہے۔ مجھ سے وہ زندگی بھر خفا رہے۔ میں نے بھی کبھی معذرت نہ کی۔ وہ ایک ارمان رکھتے تھے کہ

کسی صورت شعبۂ اردو میں ان کی پذیرائی ہو۔ فاروقی صاحب دہلیز پر بھی ان کے قدم رکھنے کے حق میں نہ تھے۔ وہ ایک سال کے لئے تاشقند گئے تو ظہیر احمد صدیقی مرحوم کارگزار صدر تھے۔ مالک رام صاحب نے وائس چانسلر پروفیسر سروپ سنگھ سے درخواست کی شعبہ میں ان کا ایک لکچر ہو جائے۔ ظہیر صاحب کم زور طبیعت کے شریف آدمی تھے۔ وائس چانسلر کی بات نہ ٹال سکے۔ پورے شعبہ کے لئے یہ سب سے گراں وقت تھا۔ اس تفصیل کا مقصد صرف یہ ہے کہ یونیورسٹیوں سے باہر کے لوگ اساتذہ پر ہمیشہ خندہ زن رہے مگر آرزومند رہتے ہیں کہ کسی بہانے ان کی پذیرائی دانش گاہوں میں بھی ہوتی رہے۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ مالک رام ہوں یا جگن ناتھ آزاد دونوں کے یہاں یہ کسک تھی۔ آزاد نے تو کئی بار خاکسار سے فرمائش کی کہ انھیں بھی مدعو کیا جائے۔ پاسِ ناموسِ اقبال نے مجھے راضی نہ ہونے دیا۔ اسی سبب آزاد پروفیسر گوپی چند نارنگ سے ہمیشہ رشک ورقابت رکھتے رہے کیوں کہ وہ یونیورسٹیوں میں بھی تھے۔ غالباً مشاعرے کی حریفانہ کشاکش آزاد کے مزاج میں سرایت کر چکی تھی۔ نیورسٹی میں شامل ہونے کی دیرینہ آرزو پوری ہوئی۔ مگر خودنمائی کے طور طریقوں میں تبدیلی نہ آسکی۔ خواہشیں بڑھتی رہیں۔ اقبالیات کے وسیلے سے نہ سہی شعری تخلیقی کے سہارے اقبال سمان کے لئے سرگرداں ہوئے۔ میری بدتوفیقی تھی کہ اس کمیٹی میں موجود تھا۔ تقریباً سبھی ارکان تماشائی تھے۔ ایک صاحب آزاد کی حمایت میں لڑنے مرنے کو تیار اور آزاد کے فتوحات کی پوری فائل لئے ہوئے بحث وتکرار میں مشغول۔ دوسری جانب ہم لوگ پروفیسر آل احمد سرور مرحوم کی تائید میں تمام دلائل سے آراستہ۔ آزاد کے Promotor کسی قیمت پر راضی نہ تھے۔ جناب حیات اللہ انصاری مرحوم کا نام پیش کیا گیا۔ اس پر انھوں نے بھی سخت برہمی کا اظہار کیا اور وہ آزاد کی حمایت سے دست بردار نہ ہو سکے۔ آخر آخر اپندر ناتھ اشک کا نام پیش کیا گیا اور پروفیسر جین کا خط بھی دکھایا گیا جس میں سفارش تھی کہ اشک صاحب بسترِ مرگ پر ہیں ان کے ساتھ ہمدردانہ سلوک کیا جائے۔ اس پر سب نے اتفاق کیا۔ آزاد کو اس کا بڑا قلق رہا اور وہ شکوہ سنج بھی رہے۔ بہ قول فیض دامنِ

دل کو حسنِ دو عالم سے بھر دینے کے باوجود بھی ان کی خانہ ویرانی نہیں گئی۔ مالک رام کے انتقال کے بعد میدان خالی ہوا تو ڈھال کے طور پر بعض جیالے ان کے بغل گیر ہوئے۔ سایۂ شجر کے طور پر آزاد راحت رسانی کرتے رہے۔ اقبال شناسی ان کا مقصود و منتہا نہ تھا۔ یہ وسیلۂ جاہ و جبروت کا ایک موثر اور مفید منصوبہ تھا۔ ان کی تیار کردہ یا لکھوائی گئی کتاب ''اقبالیات آزاد'' کو دیکھئے۔ اقبالیات کم اور ان کے فتوحات کی داستان سرائی پر ہی یہ موقوف ہے اور اس مکروہ بدعت میں ہمارے بہت سے ادیب و اساتذہ ملوث ہوئے۔ ان کی تصانیف ''اقبال اور اس کا عہد'' سے لیکر ''اقبال اور کشمیر'' تک یا جملہ تحریریں دیکھئے۔ وہ شرر سے شعلہ تک رسائی میں ہماری مدد نہیں کرتیں۔ وہ پروفیسر گیان جین کے مضمون ''اقبال کا عروضی مطالعہ'' کے برابر بھی کوئی مضمون نہ لکھ سکے۔ پروفیسر جین کی کتاب ''اقبال کا ابتدائی کلام'' تک رسائی کی ہم ان سے توقع ہی نہیں کرتے۔ وہ زندگی بھر دوسروں کی محفل میں زیب و زینت ضرور بنے مگر اقبال کے نام پر ایک قومی سطح کا مذاکرہ بھی منعقد نہ کر سکے۔ اگر چہ اسی کشمیر میں پروفیسر آل احمد سرور تقریباً ہر سال قابلِ رشک مذاکرے کی محفل سجاتے رہے۔ اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اقبال سے کتنے قریب تھے۔ یا اقبال کتنے عزیز تھے۔ اس فرض کفایہ کی ادائیگی کے لئے فطرت نے دوسروں کو منتخب کیا۔ جو نہ اقبال چیر پر فائز تھے اور نہ ہی اقبال شناسی کے دعوے دار۔ ایک اور پہلو بھی دیدنی ہے۔ اقبال پر ان کی پہلی کتاب ''اقبال اور اس کا عہد'' ہے جو ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ پندرہ سال بعد ان کی دوسری کتاب ''اقبال اور مغربی مفکرین'' شائع ہوئی۔ وہ ۱۹۶۸ء میں کشمیر آچکے تھے۔ گویا کشمیر آنے کے سات سال بعد یہ کتاب منظرِ عام پر آئی۔ ۱۹۷۶ء میں ایک بہت معمولی کتاب ''اقبال کی کہانی'' شائع ہوئی۔ ۱۹۷۷ء میں چار کتابچے اور شائع ہوئے۔ جس میں تصویروں کا ایک البم اور ''بچوں کا اقبال'' بھی شامل ہے۔ یہی سال جشنِ اقبال کے ہنگامے اور بہتی گنگا سے بہرہ مند ہونے کا بھی ہے۔ اسی سال وہ پروفیسر ایمریٹس کے اعزاز سے بھی نوازے گئے۔ شعبے کی صدارت بھی مالِ غنیمت کے طور پر ملی۔ بعد ازاں پانچ سال بعد ۱۹۸۲ء میں انگریزی میں کتاب شائع ہوئی

اور ۱۹۸۹ء تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ ۱۹۸۹ء کے بعد وہ اقبال سے دست کش ہو گئے۔ پھر پندرہ سال یعنی انتقال تک اقبال کی طرف رُخ بھی نہیں کیا۔ کم سے کم ان کی Chronology سے یہی پتہ چلتا ہے جو پختہ روشنائی میں موجود ہے اور بڑے اہتمام سے شائع کرائی گئی ہے۔ ترجیحات بدل گئیں۔ مذاکروں، مشاعروں اور میٹنگ نے مہلت نہ دی کہ وہ اقبالیات کی طرف متوجہ ہوتے۔ اپنی بات پھر دہراتا ہوں کہ اقبالیات سے ان کا شغف منصوبوں، مصلحتوں اور مجبوریوں کا محکوم تھا۔ ان تمام کوتاہیوں کے باوجود وہ اقبال کے شارح، مداح اور تجزیہ نگار کے طور پر قدر کی نگاہ سے دیکھے جائیں گے۔ مجھے اعتراف ہے کہ اقبال کو مقبول عام اور متعارف کرانے میں ان کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جائے گا۔ خاص طور پر اس زمانے میں جب اقبال کے نام کو انگیز کرنے کے لئے ایک بڑا طبقہ آمادہ نہ تھا۔ برادرانِ وطن کے ساتھ ترقی پسند طبقہ بھی نالاں و گریزاں تھا۔ ایسی پر آشوب سیاہ رات میں مفلس کا دیا بھی رہبری کے لئے قندیلِ رہبانی کا کام کرتا ہے۔ آزاد کی شاعری اور شخصیت کا رنگِ سخن ماند پڑ جائے گا مگر اقبالیات میں ان کی تحریریں انہیں یاد دلاتی رہیں گی۔ اقبال پر لکھنے والے تمام غیر مسلم ادیبوں میں آزاد کی عقیدت مندی قابلِ ستائش ہے۔ جسے خراج پیش کرنے کے لئے ہم مامور ہیں اور مجبور بھی۔

گذشتہ دہائی میں اقبالیات
(۱۹۹۲-۲۰۰۲ء)

سعیِ مسلسل اقبال کے تفکیری نظام کا تکملہ ہے اور تلازمہ بھی۔ جس میں لمحاتی قیام بھی قاطعِ حیات ہے۔ آوازِ رحیل بھی درماندہ مسافر کی صدائے دردناک کی دلیل ہے۔ کیوں کہ کارواں نے قیام کیا۔ خواجہ حافظ نے تو ایک ثانیہ کے لئے ٹھہر جانے کا انجام کارواں سے بچھڑ جانے کا اندیشہ بتایا تھا۔ اقبال مرگِ مفاجات کہتے ہیں۔

اے مسافر جاں بمیرد از قیام
زندہ تر گردد ز پروازِ مدام

اقبال کے اس فکری تصور کی خارجی تمثیل ہر طرف چشم بینا کو دعوتِ نظر دے رہی ہے۔ اقبالیاتی مطالعہ میں دانشِ رواں کا ایک جہد مسلسل دکھائی دیتا ہے۔ ان کی زندگی سے ہی مطالعے اور مباحثے کا توسیعی تسلسل جاری ہے۔ خوشگوار اضافے بھی مشاہدے میں موجود ہیں۔ نصف صدی پر محیط مطبوعات کا سرمایہ شرح و بیان کا اعجاز ہے۔ اعتراف اور اعراض کی مثالیں بھی کثرت سے دستیاب ہیں۔ گذشتہ دہائی پچھلی روایات سے پیوستہ اور قدرے نئے اور اضافی فکر کی مظہر ہے۔ ان میں نئی فکری بصیرت کی جھلک اور آئندہ کی بشارتیں بھی بیدار دکھائی دیتی ہیں۔ یہ اعتراف بھی پیش کروں کہ اس دوران ہم بعض بزرگوں کی بلندی کو نہ

چھو سکے میری مراد ''روحِ اقبال'' ''فکرِ اقبال'' اور ''شعرِ اقبال'' سے ہے۔

حریفاں بادہا خوردند و رفتند

پھر بھی مایوس نہیں ہوں۔ شاید انھیں کے آغوش سے پیدائی ہو اور وہ حریفِ سنگ ہو سکے۔ اقبال نے تو ''صدیوں میں کہیں پیدا ہوتا ہے حریف اس کا'' کہہ کر زمانے کا تعین کیا ہے۔ یوں بھی وقت کی بے کراں کیفیات کو ماہ و سال کی کمند میں اسیر کرنا آسان نہیں ہے۔ ہماری ثقافت بتاتی ہے کہ دانش وری دیدۂ امکاں سے دور نہیں ہوتی۔ اس کے بطن میں تخلیقی تفاعل کی تربیت ہوتی رہتی ہے۔ روز و شب کے ارتباط سے ہی استقبال کا نمود ممکن ہے۔

اس دوران جو کچھ سامنے آیا ہے۔ اس کا استحضار مشکل ہے۔ اس دو روزہ مذاکرے میں اہلِ علم کے خیالات سے مستفیض ہونے کے باوجود آپ کو تشنگی کا احساس ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ کئی پہلو احاطۂ تحریر میں نہیں آپائیں گے۔ میرا گمان ہے کہ اس عشرے کے اکتسابات کی جمع و تدوین کے لئے تقریباً پچاس ہزار صفحات درکار ہوں گے۔ اور ان کے مربوط تجزیہ کے لئے کم سے کم دو جلدیں بھی ناکافی ہوں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبالیات کے مطالعہ میں جس طرح خاص و عام متوجہ ہیں اس کا یہ ناگزیر حصہ ہے۔ یہ اعزاز شاید ہی دنیا کے کسی ادیب کو حاصل ہو۔ یہ اضافہ حیرت انگیز ہے۔ ۱۹۹۶ء میں اقبال اکیڈمی پاکستان نے چار سو صفحات پر ایک ''اشاریہ مضامینِ اقبال شناسی'' شائع کیا جس میں مرتب قمر عباس نے مستقل کتابوں میں شامل پانچ ہزار مضامین کی فہرست پیش کی ہے۔ سید نجف علی شاہ نے رسائل اور جرائد کے مضامین کا اشاریہ الگ سے شائع کیا ہے۔ خود اقبالیات کے مطالعہ پر اب تک متعدد مطبوعات منظر عام پر آچکی ہیں۔ اب تو انھیں بھی مختلف منصوبوں میں منقسم کر دیا گیا ہے۔ جیسے پاکستان میں اقبالیات، بھارت میں اقبالیات، کشمیر میں اقبالیات وغیرہ۔

اتنے ہمہ گیر موضوعِ سخن کو سمونا صرف حرفِ تمنا ہے۔ اور آپ جیسے قدر شناسوں کے روبرو پیش کرنا بجز ندامت کے کچھ نہیں حاصل ہونے والا مگر اقبال کے اجداد کی سرزمین کے وارثوں اور اقدارِ اقبال کے محافظوں کی کرم گستری سے توقع ہے کہ وہ درگزر فرمائیں گے۔

یہ سرسری اشاریہ ہر طرح کی ادعائیت سے عاری اور ممدوح کی ستائش سے ماورا ہے میری

نظر میں مطالعہ یا جائزے کے کئی ضمنی عنوانات ہو سکتے ہیں۔ پہلی صف میں اقبال پر مستقل تصانیف کو لے سکتے ہیں۔ دوسرے زمرے میں مقالات کے مجموعے شامل کئے جا سکتے ہیں۔ تیسری طرف خصوصی شمارے ہیں یعنی رسائل کے اقبال نمبر ہیں چوتھے ان جرائد و رسائل میں چھپے اقبال پر متفرق مضامین ہیں۔ پانچویں مختلف عنوانات پر مشتمل مضامین کے مجموعے ہیں جن میں اقبال پر بھی دو ایک مضمون ہیں۔ چھٹے دانش گاہوں کے تحقیقی مقالات ہیں جو مطبوعہ اور غیر مطبوعہ صورتوں میں جگہ جگہ محفوظ ہیں۔ ساتویں حیثیت ان کتابوں کی ہے جو قومی و بین الاقوامی مذاکروں کی دین ہیں۔ آٹھویں صف میں اشاعت ثانی کے نتائج ہیں جو اس دہائی میں دوبارہ طبع ہوئیں۔ نویں فہرست میں شرح و تراجم کو شمار کر سکتے ہیں۔ دہائی کی دسویں دست یابی میں وہ کاوشیں شامل ہیں جو دوسری زبانوں میں لکھی گئیں۔ یہ بھی اقبالیات کا اعجوبہ ہے کہ تنقیدی کتابوں کے اردو تراجم بھی ہماری رسائی میں ہیں جیسے روائع اقبال یا اقبال شاعر اور سیاست داں وغیرہ۔ اس حنابندی میں گیارہویں نمبر پر خود علامہ کی تخلیق و تحریر کی نئی دریافتوں اور تدوین نو کو شامل کر سکتے ہیں۔ اس ضمن میں نئے تراجم بھی شامل کئے جا سکتے ہیں۔ جیسے پروفیسر سمیع الحق کا اقبال کے اہم ترین خطبات Reconstruction of Religious Thought in Islam جو ۱۹۹۴ء میں ''تفکر دینی پر تجدیدِ نظر'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ گویا سید نذیر نیازی کے بعد یہ اہم ترجمہ ہے۔ اسی طرح ''اسرارِ خودی'' کا فراموش شدہ ایڈیشن بھی نئی معلومات کے ساتھ ۱۹۹۳ء میں محترمہ شائستہ خاں نے شائع کرایا ہے۔ Stray Reflection کو اقبال کی مزید نئی تحریروں کے ساتھ ڈاکٹر تحسین فراقی نے مرتب کیا ہے۔ جو لاہور سے شائع ہوا ہے۔ اور پھر کلامِ اقبال کا کیا کہنا جو بار بار شائع ہوتا رہا ہے۔ آزادی کے بعد ہندو پاک میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا اقبال کا کلیاتِ اردو ہی ہے۔ یہ سب کچھ اقبالیات سے ہی منسوب و معنون ہیں۔ اب آپ ہی فیصلہ فرمائیں میری تابِ گفتار عاجز ہے کہ چند لمحوں کی صحبت میں سب کچھ کہہ سکوں اور آپ کی سماعتوں پر بار بھی نہ بنوں۔ گو یم اور نگو یم دونوں کی آزمائشوں سے دو چار ہوں۔ اقبال ابلاغ کے اس منزل پر ضرور فائز تھے اور ''بحر نے

میتواں گفتم تمنائے جہانے را'' کہنے میں حق بہ جانب تھے۔ راقم اس تاب وتواں کے عشرِ عشیر سے بھی محروم ہے۔

زیرِ نظر یادداشت میں اس دہائی کی چند اہم اور مستقل تصانیف کا ایک مختصر اشاریہ آپ کے روبرو لایا جاسکتا ہے۔ جس میں اقبال کے فکروفن پر سنجیدہ توجہ دی گئی ہے۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری عصری انتقاد میں ایک اہم مقام پر فائز ہیں اور اقبالیات میں بزرگ ترین شخصیت کے امین ہیں۔ انہوں نے اقبال شناسی میں جو مقام پیدا کیا ہے وہ قابلِ رشک ہے۔ ''نقد ونظر'' کے ذریعہ مطالعۂ اقبال کو ایک عمومی حیثیت ملی ہے۔ ان کی دقیع تحریریں کتابی صورت میں بھی موجود ہیں۔ ''اقبال کی تیرہ نظمیں'' نصابی ضرورت کے علاوہ فنی تجزیے میں تمثیل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اضافوں کے ساتھ ۱۹۹۴ء میں ''اقبال کی منتخب نظمیں اور غزلیں'' کے نام سے نیا ایڈیشن سامنے آیا۔ اقبال حرف ومعنی مطبوعہ ۱۹۹۸ء جیسی خیال افروز اور تنقیدی بصیرت سے معمور تصنیف بھی ان کی کاوشِ فکر کا نتیجہ ہے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی دور حاضر کے سب سے بڑے طنز ومزاح نگار اور دردمند ادیب ہیں جن کی فکر وتحریر میں اقبال کی سرمستی وسرشاری موجِ خوں بن کر رواں ہے۔ ان کی تحریروں کو جمع کر کے ان کے ایک عاشق لطیف الزماں خاں نے ''پیامِ اقبال'' کے نام سے ۱۹۹۷ء میں شائع کیا۔ یہ مضامین پرانے ہیں اور شائع شدہ بھی۔ یہ مضامین کتابی صورت میں اور برِ صغیر کے سب سے بزرگ ادیب کے بہت ہی فکر انگیز خیالات سے معمور مرقع کی حیثیت رکھتے ہیں اس لئے ان کا ذکر ناگزیر سمجھا گیا۔

اسی ذیل میں پروفیسر آل احمد سرور کا ''دانش ور اقبال'' شائع شدہ مضامین کے مجموعہ کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔ جو ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا اس فہرست میں شبیر احمد خاں غوری کے پرانے اور مطبوعہ مضامین کا مجموعہ بھی شامل ہے جسے خدا بخش لائبریری نے ''اقبالیات'' کے نام ہے۔ ۱۹۹۸ء میں شائع کیا ہے۔ میری نظر میں اسلامی فلسفے پر جو عبقری نظر استاذی مرحوم شبیر احمد خاں غوری کو حاصل تھی وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آئی۔ فلسفہ زماں ومکاں پر ان کی تحریریں اقبالیاتی مطالعہ کی آبرو ہیں۔ اقبال کے فکری نظام کی بازآفرینی میں جو

بالیدگی انھیں ملی تھی وہ قابلِ رشک اور صد آفریں ہے۔ اس طرح اس دہائی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ برگزیدہ مصنفین کی تحریروں کی جمع و تدوین پر متوجہ ہے اور بھی کئی کتابوں کی یہی صورت حال ہے۔ پروفیسر شمیم حنفی کی ''حرفِ تمنا'' پرانے مضامین کا مجموعہ ہے۔ مطالعہ وسیع ہونے کے باوجود موصوف سنجیدگی کے ساتھ اقبال کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔

علامہ پر شروع سے ہی انگریزی زبان میں بھی لکھنے کا سنجیدہ کام ہوتا رہا ہے۔ اس دہائی میں بھی نمائندگی ہوئی ہے۔ عبدالرشید بھٹ کی Iqbal's Approach to Islam (1996) ایک مختصر مگر خیال افروز نگارش ہے۔ اس سے زیادہ اہم اور اختلافی کتاب ڈاکٹر رفیق زکریا کی Iqbal the Poet and the Politician ہے۔ جس میں مصنف کی خام فکر اور مستعار لہجے کی مذموم صورت بہت نمایاں ہے۔ وہ بھی بہت سے قوم پرست ہم وطنوں اور اردو کے مزعومہ ناقدین کی طرح اقبال کی شاعرانہ سحر آفرینی کے قائل ہیں مگر فکر و نظر کے منکر ہیں۔ اقبال کی سیاسی فکر پر مصنف کی عامیانہ نظر نے ان کے موقع پرستانہ ذہنیت کو برہنہ کر دیا ہے۔ اقبال کی شخصیت پر جھوٹے حوالوں سے اتہام تراشی کی بدنما مثال بھی قائم کی ہے۔

فکرِ اقبال سے اختلاف رکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد ہے۔ بیشتر وہ لوگ ہیں جو مسلم ثقافت سے ہی بیزار اور منحرف ہیں بعد ازاں قومی دھارے میں خس و خاشاک کی طرح بہنے والے افراد بھی ہیں۔ اس دہائی میں کچھ نام دئے جا سکتے ہیں جنھوں نے مراجعت بھی کی۔ اور اپنی پرانی تحریروں پر پشیمان بھی ہوئے ہیں۔ جدید و قدیم کے لاطائل مباحث پر بیشتر ناقدین شعرِ اقبال کے ابدی اقدار پر سنجیدگی سے متوجہ ہیں۔ ساختیات کی صیہونی فکر کے ناسمجھ ناقدین کا بھی یہی حال ہے۔ پوری صدی پر غور فرمائیں اس بے مثل عظیم مفکر شاعر کے موثرات کو مسمار کرنے کی کیسی کیسی تدبیریں کی گئیں۔ شاید ہی دنیا کے کسی فنکار پر ایسی ناشائستہ تحریریں دیکھنے میں آئیں۔ مگر اقبال کے اثر و نفوذ کی بے کرانی بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ Span کے پچھلے شمارے میں Visionaries Under 30th کے تحت امریکہ کے مسلم نوجوانوں میں اقبال کی عبقری فکر کے نفوذ کا ذکر ہے۔ اندازِ کوفی شامی

کے بدلتے رہنے سے ہی مقامِ شبیریؑ کی ابدیت کا ادراک ہوتا ہے۔ یہ ادراک اقدار کے ارتقاعی تصور کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اقدار کی ارتقاعیت الہیاتی انوار سے اکتساب کرتی ہے۔ اور الہام ووجدان کی صورت میں فروغِ نظر بخشتی ہے جس سے رازِ درونِ حیات منکشف ہوتے ہیں۔ اشعار ہوں یا ابلاغ۔ سب ان بلندیوں سے گزر کر ہی جاوداں بنتے ہیں۔

درس وتدریس سے وابستہ اساتذہ کی اقبال شناسی قابلِ ستائش ہے۔ ان کی ایک اپنی شناخت اسی توسط سے قائم ہوتی ہے۔ بڑا استاد اور بڑا نقاد بننے کے لئے اقبال شناسی ایک اہم ترین میزان قائم کرتی ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ اقبال ایک ناگزیر حیثیت رکھتے ہیں۔ انھیں نظر انداز کر کے کوئی بھی نقاد یا ادیب سرخ رو نہیں ہوسکتا۔ پچھلی صدی کے تمام انتقادی اور تخلیقی ادب کو دیکھ لیں۔ رشید احمد صدیقی نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اقبال کے مطالعہ کے بغیر ہم کسی شائستہ محفل میں بیٹھنے کے مجاز نہیں ہوسکتے۔ اساتذہ کا اقبال شناسی کے تذکرے میں عبدالقوی دسنوی کے مختصر جائزے بھی اہم ہیں اگرچہ اس دہائی میں ان کی کوئی قابلِ قدر کتاب میری نظر سے نہیں گزری۔ پروفیسر نورالحسن نقوی کی ''اقبال شاعرومفکر'' درسی ضرورت کی کفالت کرتی ہے۔ ہاں پروفیسر حامدی کی معنی آفریں کتاب ''اقبال کا تخلیق شعور'' بیش قیمتی اضافہ اور ''حرفِ راز'' بھی قابلِ ذکر ہے۔ وہ اگر اکتشافی تنقید کی بھول بھلیوں سے باز آتے تو اور بھی اچھی تنقید لکھ سکتے تھے۔

اقبالیات میں تصوف کی تعبیر وتنکیر پر خاصی توجہ دی گئی ہے۔ دو اندازِ فکر نمایاں اور متوازی رہے ہیں۔ پروفیسر بشیر احمد نحوی کی ''مسائلِ تصوف اور اقبال'' اعتدال پسندی کی ایک وقیع مثال ہے۔ ماخذ ومصادر سے لے کر تاریخ وتذکرے کی روشنی میں اقبال کے تصورات کا تجزیہ خود مصنف کے اقدار پرست ذہن کی غمازی کرتا ہے۔ اسی طرح اقبال انسٹیٹیوٹ کی ایک دوسری اہم کتاب پروفیسر قدوس جاوید کی ''اقبال کی جمالیات'' چند مقالات پر مشتمل ہے۔ یہ عنوان ایک مقالے کی صورت میں پیوستِ مقالات ہے۔ دوسرے مضامین نئے اور علمی نشاط کی نوازشوں سے ہمیں سرشار کرتے ہیں۔ پروفیسر نحوی نے نفحات اقبال اور اقبال ایک تجزیہ کو ترتیب وتسوید سے آراستہ کیا ہے۔ وہ بذاتِ خود اقبال

شناسی کی تحریک وتبریک کے ایک جواں سال راہ گذار ہیں۔ مذکورہ ادارے نے اور بھی گراں مایہ کتابیں شائع کی ہیں۔ یہ اشاعتیں ہمارے دامنِ خیال کو آفاقی وسعتوں سے ہم کنار کرتی ہیں۔ خاص طور پر اقبالیات کے مقالے نئی بشارتوں سے بھرپور ہیں۔ ایوانِ اردو کا اقبال نمبر ۲۰۰۳ء بھی خاصی اہمیت رکھتا ہے۔

اس اظہار میں کوئی ہرج نہیں کہ اقبال کے مطالعہ کا ایک اہم جز وہ تحقیقی کاوشیں ہیں جو خصوصی مطالعہ اور حصولِ اسناد کے لئے دانش گاہوں میں جاری ہیں۔ جس میں معیاری بھی ہیں اور کم عیار بھی۔ اب تک جس کثرت سے اقبال کے فکروفن پر مقالے پیش کئے گئے کسی دوسرے فن کار پر توجہ نہیں دی گئی۔ ان کے تجزیہ وتنصیف پر الگ سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ آزادی کے بعد نصاب ودرسیات میں اقبال کو نظر انداز کئے جانے کے باوجود یہ کام جاری رہا۔ ۴۷ء کے بعد غالباً اکبر حسین قریشی کی ''تلمیحاتِ واشاراتِ اقبال'' پہلا تحقیقی مقالہ ہے۔ جس پر سند تفویض کی گئی۔ راقم کو ۱۹۶۵ء میں نوازا گیا۔ اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ پروفیسر آفاق احمد کی نگرانی میں دو مقالے پیش کئے گئے جو شائع نہیں ہوسکے ہیں۔ ناچیز نے بھی چھ مقالے لکھوائے۔ جن میں تین شائع ہوچکے ہیں اور ایک اشاعتی مرحلے میں ہے۔ بیشتر مقالے صرف کتب خانوں کی زینت بن سکے۔ ان کی اشاعت کی طرف بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر توقیر احمد خاں کا مقالہ ''اقبال کی شاعری میں پیکر تراشی'' ۱۹۸۹ء میں سامنے آیا۔ مگر اسی مطالعہ سے ''بال جبریل کی پیکر تراشی'' اس دہائی میں اشاعت پذیر ہوئی۔ ڈاکٹر نفیس حسن نے گذشتہ برسوں ''فکرِ اقبال کے مشرقی مصادر'' شائع کیا دونوں مقالے اقبالیات کے نئے امکانی زاویوں کی نشان دہی کرتے ہیں۔ تیسرے جواں سال استاد ڈاکٹر صادق علی (ٹونک) کا بہت وقیع مقالہ ''اقبال کے اردو کلام کی مبسوط فرہنگ'' کی پہلی جلد شائع ہوگئی ہے دوسری پریس میں ہے۔ اس مطالعے سے حاصل دو کتابیں شعریات اقبال کی تفہیم میں معاون کتابیں شائع ہوئیں۔ ''اقبال کی شعری زبان'' (۱۹۹۴ء) اور ''اقبال کے شعری اسالیب'' (۱۹۹۹ء) قابلِ قدر کاوش کے لئے راقم انہیں مبارک باد دیتا ہے۔ اقبال پر ایک اور

گراں قدر اور سب سے ضخیم مقالہ ''اقبالیات کا تنقیدی مطالعہ'' گلبرگہ یونیورسٹی میں داخل کیا گیا۔ جسے ڈاکٹر کریم رضا نے دو جلدوں میں پیش کیا تھا۔ یہ مقالہ ابھی تک شائع نہیں ہو سکا ہے۔ ڈاکٹر آفاق فاخری کا مقالہ فکرِ اقبال کے سرچشمے شائع ہو چکا ہے۔ یہ مقالہ اودھ یونی ورسٹی فیض آباد میں پیش کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر منظر اعجاز کا مقالہ ''اقبال اور قومی یکجہتی'' ۱۹۹۹ میں شائع ہوا ہے۔ میری محدود معلومات میں اقبال پر پہلا ڈی لٹ کا مقالہ الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں داخل ہوا جو ابھی تک شائع نہ ہو سکا۔ پروفیسر عبدالقادر جعفری صدر شعبۂ عربی وفارسی کا یہ مقالہ اِس دہائی سے بہت پہلے ڈی لٹ کی سند سے فیضیاب ہو چکا ہے۔

اساتذہ کی تالیفات سے الگ حلقۂ درویشاں میں بھی اقبال کی پسندیدگی اور پذیرائی قابلِ اعتنا ہے۔ عبدالسلام کی کتاب افکارِ اقبال بھی اقبالیات پر اپنا جواز رکھتی ہے۔ جو ۱۹۹۱ء میں شائع ہوئی ہے۔ اقبال ایک سیاستداں محمد صدیق قریشی کی یادگار ہے جو ۱۹۹۳ء میں اسی سرزمین سے شائع ہوئی ہے۔ حیات اقبال سے متعلق کئی کتابیں منظر عام پر آئیں۔ ۱۹۲۳ء میں چھپنے والی احمد دین کی پہلی کوشش ''اقبال'' ہے۔ جسے پچھلی دہائی میں برصغیر کے بڑے محقق نے تحقیق وتدوین سے آراستہ کر کے شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر مشفق خواجہ مرحوم کا یہ کارنامہ بھی ان کی علمی فتوحات میں شامل ہے۔ دورِ حاضر کے بڑے خوش فکر شاعر حکیم منظور نے ''اقبال ایک تذکرہ'' لکھ کر اس دہائی کی دریابی میں اچھا اضافہ کیا ہے یہ خاص وعام کے لئے یکساں افادیت کی حامل ہے۔ یہاں تخلیق کار کی تنقیدی تربیت دوسرے ناقدین سے زیادہ دلآویز ہوگئی ہے۔

اقبالیاتی مطالعہ اور اس کی نشر واشاعت میں تین اداروں کی بیش بہا خدمات سے آپ واقف ہیں۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ کی علمی اور عملی یافت فروغِ اقبال میں ایک مرکزِ نور ہے۔ ادارے کی خدمات کا جائزہ کوئی اور پیش کرے گا۔ جس سے آپ کو اندازہ ہو سکے گا۔ دوسرا ادارہ بھوپال کا اقبال ادبی مرکز ہے۔ جو ایک بڑی کارکردگی کا مظہر ہے اور اقبال شناسی کے لئے ہر سال طرح طرح کی مساعی میں مصروف رہتا ہے۔ اس کی مطبوعات بے حد وقیع اور عالمانہ حیثیت رکھتی ہیں۔ ''بیاد مجلس اقبال'' کا تازہ شمارہ جسے پروفیسر آفاق احمد نے ۱۹۹۳ء میں شائع

کیا ہے۔ مذاکرے کے مقالات پر مشتمل اسی سلسلے کی یادگار ہے۔ اس سے قبل اقبال کے نیاز مند جناب ممنون حسن خاں کی ان تھک کوششوں نے اقبال پر مستقل کام کرنے کا بڑا حوصلہ دیا ہے۔ یہ مجلّہ کئی بار شائع ہو چکا ہے ان کے علاوہ ماسٹر اختر بھی اقبالیات میں بڑی گرم جوشی کے ساتھ نئے انکشافات بروئے کار لا رہے ہیں۔ ہم ان کی کاوشوں کو تہنیت پیش کرتے ہیں۔

تیسرا اہم ادارہ اقبال اکیڈمی حیدر آباد ہے۔ جو کتابوں، مذاکروں کے علاوہ اقبال ریویو کے نام سے مجلّہ بھی شائع کرتا رہتا ہے۔ ان میں منعقدہ مذاکرے کے مقالات کی اشاعت بھی شامل ہے۔ اس ادارے میں جمع کردہ اقبالیات سے متعلق وہ بیش بہا ذخیرۂ تحریر ہے جو میری نظر میں ملک میں کہیں نہیں میسر ہے۔ یہ ادارہ کسی بھی سرکاری سرپرستی سے بے نیاز اور چند مخلص وایثار پسند اقبال شناسوں کے دردِل کی کشادگی کا پیکر ہے۔ میری خواہش ہوگی کہ ان تینوں اداروں کے درمیان ایک ہم آہنگی اور گہرے ربط کی طرف بھی توجہ دینے کی اشد ضرورت ہے۔

مقررہ زمانے سے قدرے دور اقبال کے متن پر کبھی کبھی مختصر گفتگو کی گئی۔ خاص طور پر خطوط یا کلام کے ابتدائی متون پر۔ اس دہائی سے قبل ماسٹر اختر کی دونوں کتابیں ''ریاست بھوپال اور اقبال'' ''اقبال کے کرم فرما'' علی الترتیب ۱۹۸۷ء اور ۱۹۸۹ء میں شائع ہوئیں۔ خطوط کے متن میں تحریف کے ایسے نمونے سامنے آئے جو شاید ہی کسی کے ساتھ واقع ہوا ہو۔ ہاں ان کے بھتیجے اعجاز الحق بھی کچھ ایسا ہی کر چکے تھے۔ مگر یہ ادبی دنیا کی سب سے مکروہ مثال ڈاکٹر لمعہ نے پیش کی تھی۔ برصغیر کے سب سے اہم اقبال شناس ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اس طرف توجہ دیتے رہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے ابتدائی کلام کے متون کی تدوین کی۔ اس دہائی میں دو بڑے اہم تبصرے سامنے آئے۔ جس میں اقبال کی تحریروں میں شامل تبدیلی و تنسیخ پر روشنی ڈالی گئی۔ برصغیر کے ایک مقتدر ناقد ڈاکٹر تحسین فراقی نے کلیات مکاتیب اقبال کے مسخ شدہ متن کی غلطیوں پر عالمانہ تبصرہ کیا۔ اس دہائی کا میرے نزدیک ایک گراں قدر حاصل مظفر حسین برنی کی مرتب کردہ جلدیں ہیں۔ اقبال کے تقریبا چودہ سو خطوط کا یہ مجموعہ ایک یادگاری کارنامہ ہے۔ مگر مظفر حسین برنی اور ان کے معاونین کی

لاپرواہی کی بدترین مثال بھی ہے۔ برنی صاحب نے غلط بھروسہ کیا۔ کیوں کہ مرتب تحقیق وتدوین سے واقف نہ تھے۔ درپردہ کام کرنے والے فرض شناس نہ تھے۔ یہ اچھا ہوا کہ چوتھی جلد میں غلط نامہ ضرور شامل ہوا مگر ڈاکٹر تحسین فراقی کی ناسپاسی کے ساتھ۔ ان کے تبصرے نے مرتب کی کوشش کو مشکوک بنادیا۔ اور تبصرے نے اقبال کی تحریروں کے تحفظ کو مطالعہ کا ملزوم جزو قرار دیا۔ دوسرا تبصرہ رشید حسن خاں کا ہے۔ جو کلیات کے گمراہ کن متن کی نشان دہی کرتا ہے یہاں بھی مرتب کی من مانی بددیانتی کو پیش کیا گیا ہے۔ حیرت ہے کہ غفلت شعاری نے غلطیوں کا باب کھول دیا ہے۔ اقدار کراچی کے شمارہ میں یہ تبصرہ شائع ہوا تھا۔ ایک صدی میں کثرت اشاعت سے کلام اقبال میں بے راہ روی شامل ہوگئی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کی تدوین وتسوید پر توجہ دی جائے۔

اس عشرہ کے ایک مسودہ کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ بھوپال کے کوثر صدیقی نے اقبال کی منتخب طویل اور مختصر اردو نظموں کو فارسی متن کے منظوم قالب میں پیش کرنے کی بڑی کامیاب کوشش کی ہے۔ مفہوم الاقبال کے نام سے۔ میری خواہش ہوگی کہ اقبال انسٹی ٹیوٹ اسے شائع کرے۔

ساقی نامہ کے ابتدائی اشعار ملاحظہ فرمائیں

فروخیمہ شد کاروان بہار ارم گشت دامانِ ہر کوہسار
جہاں شد افق تا افق نورد رنگ لہو گشت رقصاں برگہائے سنگ
فضا نیلگوں، باد غرقِ سرور نیگرندم، درنشیمن طیور
آں جوئے کہستاں گریزاں بہ ناز خراماں خراماں بہ بازونیاز
چماں وگریزاں، ستیزاں تپاں فروزاں، خردشاں، خراماں رواں

ایک اور مسودہ دردمند دل رکھنے والے اسرار جامعی کا ہے جو اقبال کی پیروڈی پر مشتمل ہے اور غیر شائع شدہ ہے۔ مثلاً لیڈر کی دعا:

ابلیس مرے دل میں وہ زندہ تمنا دے
جو غیروں کو اپنا لے اور اپنوں کو ٹرخادے

پیدا دلِ ووٹر میں وہ شورشِ محشر کر
جو جوشِ الکشن میں نعرہ مرا لگوادے

احساس عنایت کر کرسی کی محبت کا
امروز کی شورش میں بے فکریٔ فردا دے

اِس دہائی کی ایک دلچسپ دریافت اقبال کی مشہور نظم ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' کی باز آفرینی و بازگشت ہے۔ علامہ نے ۱۹۳۶ء میں یہ نظم لکھی تھی۔ اس کی تقلید اور اشتراکیت کی تعریف میں کیفی اعظمی نے ۱۹۸۳ء میں دوسری مجلس منظوم کی تھی۔ یہ تخلیقی ضائی اور تفکیر دونوں سے خالی ہے۔ ستمبر ۱۹۹۴ء میں پروفیسر محمد حسن نے ترقی پسند شعرا کے موقع پرستانہ مزاج کے خلاف تیسری مجلس منعقد کی تھی۔ نومبر ۱۹۹۶ء میں سید غلام سمنانی (انگریزی کے استاذ دہلی یونی ورسٹی) نے 130 اشعار پر مشتمل چوتھی شورائی محفل آراستہ کی تھی۔ اس میں اقبال کے خیال کی تائید کرتے ہوئے اسلام کو ہی فتنۂ فردا کہا گیا ہے۔ پانچویں مجلس فنا پرتاب گڑھی نے احمد آباد میں منظوم کی۔ اس دہائی کے تجزیئے کا یہ دل کش اعجوبہ ہے۔

کیفی کی نظم کا حاصل ہے کہ اقبال کا تصور:

مزدکیست فتنۂ فردا نہیں اسلام ہے

غلط تھا۔ مستقبل میں اشتراکیت کا ہی ڈنکا چار سو بجے گا اور ساری دنیا اسی کے زیرِ نگیں ہوگی۔

کیوں فروغِ اشتراکیت سے تو ہے دردمند

پروفیسر محمد حسن نے کیفی کے ساتھ ان سبھی ترقی پسند شعرا کی ملامت میں یہ نظم لکھی جنہوں نے اقتدار کی ہم نوائی یعنی وزیر اعظم راجیو گاندھی کی حمایت میں اعلانیہ جاری کیا تھا۔ نظم کیفیتوں سے بھرپور ہے اشعار کے آہنگ کا بہاؤ بڑا موثر ہے۔ دوسرا مرید ابلیس سے مخاطب ہے:

ایسی کچھ تدبیر کیجئے سچ کوئی کہنے نہ پائے
فکر یوں شل ہو کوئی فکرِ نوی لکھنے نہ پائے

یا قلم کو چھین لیں یا کاٹ ڈالیں ان کے ہاتھ
یا زبانیں کھینچ لیں ان سب کی بے دردی کے ساتھ

ابلیس گریز کرتا ہوا جواب دیتا ہے۔
ابلیس نے اشارے کنایہ میں سب کچھ ڈالے۔ سردار جعفری، کیفی اعظمی، مجروح سلطان پوری اور اختر الایمان کے لئے یہ تازیانۂ عبرت تھا جو عصرِ حاضر کے سب سے موقر مارکسی نقاد نے پیش کیا ہے۔
اس سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے سید غلام سمنانی مرحوم نے معارف نومبر ۱۹۹٦ء میں ابلیس کی مجلس شوریٰ کا چوتھا اجلاس قلم بند کیا۔ نظم شکوہِ الفاظ سے بوجھل ہے لیکن یہ قوتِ بیان کی انوکھی مثال پیش کرتی ہے۔ قصیدے کا جلال پوری نظم پر حاوی ہے۔ سید غلام سمنانی دہلی یونی ورسٹی میں انگریزی کے استاد تھے عربی و فارسی کلاسیکی سرمایہ کا تبحر قابلِ رشک تھا۔ اقبال سے انھیں بڑا شغف تھا۔ پیامِ مشرق کی ''لالۂ طور'' کی رباعیوں کا انگریزی میں بہت کام یاب ترجمہ بھی کیا تھا۔ مسجدِ قرطبہ کی واپسی پر بڑی خوب نظم تخلیق تھی۔ یہاں بھی آپ دیکھیں گے کہ ان کا جوش وخروش موجیں مار رہا ہے۔ دوسرا مشیر کہتا ہے۔

تو ملائک کا معلم، مرشدِ کرو بیاں
ساری عظمت کھودی تو نے کر کے انکارِ سجود

فتنۂ صیہونیت ہے تیرا ممنونِ کرم
مغتنم اس کے لئے تھا کس قدر تیرا وجود

تو نے بخشا ہے کسی شے کو میانِ عرش وفرش
چشمہ سارو بحر و دریا شہر وصحرا نہر ورود

تیسرا مشیر گویا ہے:
کیا ہزیمت ہی ہزیمت ہے تری تقدیر میں
تیری ذریت کے بھی احوال ہیں زار وزبوں

چرچل و کچنر، ایلن بی کیا تھے تیرے زر خرید
ان کو سکھلائے تھے تو نے سارے آدابِ جنوں
ابلہِ کہسار نے کیوں کر تجھے پسپا کیا
کاش کوئی تو سمجھ لیتا تیرا سوزِ دروں

کیفی نے ساٹھ اشعار کہے ڈاکٹر محمد حسن نے کل اکتیس اشعار قلم بند کئے۔ سید غلام سمنانی نے ایک سو اکتیس اشعار کہے۔ فنا پرتاپ گڑھی نے کل ۱۹ اشعار پیش کئے ہیں۔ جب کہ اقبال کی نظم چوہتر اشعار پر مشتمل ہے۔ گویا اقبال کی ایک نظم کی بدولت اردو کو 241 اشعار ملے۔ ابھی کتنا اضافہ ہوتا رہے گا۔ یہ کہنا مشکل ہے۔

ان حوالوں سے اتنا تو ظاہر ہے کہ اقبال کا تذکرہ مختلف محفلوں میں عنوان اور اوقات کی تبدیلی کے ساتھ ہوتا رہتا ہے گویا ہر دور میں کلامِ اقبال جمالِ ہم نشیں کی طرح ہم آغوشی کے آداب سیکھنے کی دعوت دیتا رہتا ہے۔ اس عشرے کی ایک اور دریافت پیش کرنا چاہوں گا۔ کئی صاحب نظر ناقدوں نے مضامین و مقالے کی صورت میں اقبال کے فلسفہ و شعر پر اپنی ندرتِ فکر کے نوادرات سے ہمیں مستفیض کیا ہے۔ جو مختلف مجموعہ ہائے مضامین میں شامل ہیں۔ اقبال کی نظم ''جبریل و ابلیس'' اردو میں ہی نہیں عالمی ادب کا شاہکار ہے۔ اس کے تجزیہ پر کئی اہلِ قلم نے توجہ کی ہے۔ وارث علوی کے انتقادی اسالیب تنقیدی راہوں کو روشن کرنے میں ہمیں ایک فرزانگی بخشتے ہیں۔ اقبال پر انہوں نے کم لکھا ہے۔ مگر اس نظم کا تجزیہ ''مشمولہ بورژوائی بورژوائی'' بلاشبہ سب پر سبقت و سیادت کا درجہ رکھتا ہے۔ نظم کے حوالے سے ان کے فلسفہ و شعر کی روح اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جائزے میں نمایاں ہے۔ ادبی تجزیہ میں یہ کوشش ایک روشن قندیل ہے۔ اور انتقادی شناوری کی شاہکار بھی۔ گذشتہ دنوں شمس الرحمٰن فاروقی نے اقبال کی غزل گوئی پر تازگی خیال سے معمور مضمون لکھ کر اقبال شناسی کا ثبوت دیا ہے۔ ابتدائی غزلوں سے بالِ جبریل تک کا محاکمہ فنی برگزیدگی کی ترسیل پر مبنی ہے۔ اقبال کی غزلیں انفرادی ساخت اور لفظ و معنی کے ارتباط کا تخلیقی اعجاز ہیں۔ ایسے ہی ایک مقالہ مصر کے نوجوان استاذ ڈاکٹر سید جلال الحفناوی کا ہے۔ جس میں پہلی بار اقبال کے معاصر مصری شاعر احمد شوقی کے

درمیان مماثلتوں، مشترک عناصر کی تلاش اور تجزیہ ہے۔ دونوں عصری شعراء کے موضوعات دینی، وطنی، سیاسی اور اجتماعی شعور کے ساتھ مغرب کی فسوں ساز حکمتِ عملی کے خلاف احتجاجی نیز انقلابی لہجے کا جلال و جبروت بہت حد تک مماثلت رکھتا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ دونوں معاصر ہیں مگر ایک دوسرے سے قطعی ناآشنا ان دونوں کے تقابلی مطالعے پر تحقیقی مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ پہل جلال الحفناوی نے ہی کی ہے۔ یہ مضمون ''اقبال کی شعری وفکری جہات'' میں شامل ہے۔ اس ضمن میں ''اقبال اور غالب شناسی'' کو بھی رکھا جاسکتا ہے۔ اس میں اقبال کے انتقادی اور فکری رویوں کے بعض نکات پہلی بار پیش کیے گئے ہیں۔ اور اقبال کو پہلا ہی نہیں بلکہ غالب کا سب سے ممتاز نقاد بتایا گیا ہے۔ راقم نے ۱۹۹۷ء میں دہلی یونی ورسٹی میں علامہ کی شعری وفکری جہات، پر ایک بین الاقوامی مذاکرے کا اہتمام کیا تھا۔ جس میں بھارت کے علاوہ بیرون ملک کے مقتدر اقبال شناس جیسے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر تحسین فراقی، ڈاکٹر ایوب صابر اور مصر کے ڈاکٹر جلال الحفناوی نے شرکت کی تھی۔ پڑھے گئے انتہائی مفید مقالوں پر مشتمل کتاب ''اقبال کی شعری وفکری جہات'' کے نام سے ۱۹۹۸ء میں شائع ہو چکی ہے۔ جشنِ ولادت کی تقاریب (۱۹۷۷ء) کے بعد یہ دوسرا بین الاقوامی مذاکرہ ہے۔ جس میں پیر و جواں شانہ بہ شانہ تھے۔ اس عشرے کے تخلیق و تجزیئے سے مطالعۂ اقبال کی مقبولیت اور معنویت صاحبِ نظر کے مشاہدہ وادراک کو نور و حضور بخشتی ہے۔ یہ حقیقت ماہ و سال کی ہر دہائی سے مربوط ہی نہیں بلکہ افزونی اور توسیع کی طلب گار رہتی ہے۔ تفہیم و تجزیہ کا یہ تسلسل ماورائے اقبالیات محدود ہے اور مفقود بھی۔ یہ مطالعہ مرکزِ پرکار کی مانند ہے۔ اس بدیہی حقیقت کی بنیاد پر موضوعِ سخن کو زمان و مکان کے تعینات میں متحضر نہیں کہا جاسکتا ہے۔

اقبال کے ممدوح اور فارسی کے بزرگ شاعر نظیری نے پیرانہ سالی کو عہدِ شباب میں بدل دینے کے لئے خوب رویوں کی رفاقت کا نایاب نسخہ بیاضِ مسیحا سے حاصل کیا تھا۔ میں آپ کا احسان مند ہوں کہ آپ نے یہ عنوان تجویز کر کے میرے کہن سالہ خیالات کو افکارِ تازہ سے طرب ناک بنا دیا۔

درباده‌ٔ امروزم کیفیتِ فردا ہیں

علی گڑھ میں اقبالیات

یہ اقبال کی خوش نصیبی تھی کہ ان کی زندگی میں ہی ان کے فلسفہ وشعر کی تشریح وتعبیر کا کام شروع ہو چکا تھا۔ ان کے انتقال کے چند برسوں بعد علی گڑھ کے دانش وروں نے مطالعۂ اقبال کو آگے بڑھایا۔ اقبالیات کی سب سے معتبر اور معروف کتاب ''روحِ اقبال'' ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں علی گڑھ سے بعد میں وابستہ ہوئے۔ بعد ازاں ''حافظ اور اقبال'' ۱۹۷۶ء ''غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات'' (۱۹۷۹ء) شائع ہوئیں۔ یہ دراصل خطبات ہیں ان میں شاید اختصار کے سبب وہ بات پیدا نہ ہو سکی۔ جو ''روحِ اقبال'' کو حاصل ہے۔ یہی وہ کتاب ہے جس کے اب تک آٹھ ایڈیشن اقبالیات میں ہی نہیں ہمارے انتقادی ادب میں امتیاز حاصل کر چکے ہیں۔ خواجہ غلام السیدین کو اقبال سے ایک گونہ عقیدت رہی ہے۔۔ ان کی دو کتابیں انگریزی زبان میں اسی زمانے میں شائع ہوئیں۔ Iqbal's Educational Philosophy (1945) میں اور Iqbal the Man and his Message بھی 1944ء میں شائع ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر عشرت حسین انور کی کتاب The Metaphysics of Iqbal لاہور سے 1943ء میں منظرِ عام پر آئی۔ غالباً یہ پروفیسر ظفر الحسن کی نگرانی میں پیش کردہ تحقیقی مقالہ ہے۔

اسی شعبۂ فلسفہ کے استاد پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے 'مثنوی پس چہ باید کرد' کا منظوم ترجمہ حکمتِ کلیمی کے نام سے (۱۹۵۵ء) شائع کیا تھا۔ اس میں ترجمہ کی دل کشی کم سہی مفہوم کی ادائیگی بھرپور ہے۔ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام ان کا نظام خطبہ بھی ''اقبال فلسفہ اور شاعری'' شائع ہو چکا ہے۔ اقبال اردو کے واحد فن کار ہیں جن کی حیثیت مختلف موضوعات کی اجتماعیت سے ہم آہنگ ہے۔ اس کا مظاہرہ علی گڑھ کے مختلف شعبہ ہائے علوم کی کاوشوں سے ہوتا رہا ہے۔ فلسفہ، تعلیم، مذہب، لسان اور ادب کے اساتذہ کی تصنیفات میں یہ امر توجہ طلب ہے۔ ان سب میں شعبۂ اردو کو سبقت حاصل ہے۔ ہونا بھی چاہیے۔ اقبال کو ناز تھا:

گیسوئے اردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے

مطالعۂ اقبال ایک مہتم بالشان موضوع ہے اور علی گڑھ کے موثرات بھی بے پایاں ہیں۔ صوری اور معنوی اعتبار سے اقبال بھی علی گڑھ سے دور نہیں رہے۔ ہماری ثقافت میں علی گڑھ ایک علامت ہے۔ یعنی برصغیر کے مسلمانوں کا مرکزِ محسوس۔ اور ان کی مدنیت کا ملجا و ماویٰ بھی۔ یہ امصار و اماکن ہی نہیں اس عظیم تحریک کی نمائندگی کرتا ہے جس کی نسبت سرسید سے قائم ہے۔ کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ سرسید کو علی گڑھ یا علی گڑھ کو سرسید سے الگ کر کے گفتگو کر سکے۔ شخصیت کا کسی شہر سے اس طرح شیر و شکر ہونے کی مثال کم ہی ملے گی اور شہر کا شخصیت میں ضم ہونا بھی اعجوبہ ہے۔ اقبال لاہور میں رہے۔ وہیں پلے بڑھے اور سپردِ خاک بھی ہوئے۔ مگر ذہنی و فکری طور پر زندگی بھر علی گڑھ کے مشن اور منشور کی ترجمانی کرتے رہے۔ تحریکِ سرسید کی توسیع و ترجمانی میں اقبال سے بہتر کوئی دوسری صورت نظر نہیں آتی۔ اقبال کو خاندانِ سرسید سے جو تعلقِ خاطر رہا وہ کسی اور حسب نسب سے قائم نہ ہو سکا۔ ایک اور زاویے کا ذکر بے جا نہ ہوگا۔ پنجاب کے علاوہ برِصغیر کا شاید ہی کوئی شہر اقبال کے لئے اس حد تک باعثِ کشش بنا ہو۔ ۱۹۱۰ء، ۱۹۲۹، ۱۹۳۴ء میں خطبات پیش کرنے کے لئے علی گڑھ بلائے گئے۔ وہاں کی حاضری ان کے لئے بڑی طمانیت بخش ہوا کرتی تھی۔ طلبا اور اساتذہ سے ملاقات اور تبادلۂ خیالات سے انھیں بڑی سرشاری حاصل ہوتی تھی۔ ان کی شہرۂ آفاق نظم

"طلبہ علی گڑھ کالج کے نام" انھیں خوش گوار یادوں کی انجمن سے آراستہ ہے:

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے
عشق کے درد مند کا طرزِ کلام اور ہے
جذبِ حرم سے ہے فروغ انجمنِ حجاز کا
اس کا مقام اور ہے اس کا نظام اور ہے

فلسفہ کی پروفیسری کی پیش کش، انتخابی کمیٹی میں کارشناس کے طور پر مدعو کیا جانا، ۱۹۳۴ء میں ڈی لٹ کی اعزازی سند کا تفویض کیا جانا سب اسی تعلقِ خاطر کے نتائج ہیں۔

بعض احباب کا یہ کہنا کہ سرسید نہ ہوتے تو اقبال نہ ہوتے یا سرسید نہ ہوتے تو فارسی زبان میں خودی کا فلسفہ نازل نہ ہوتا۔ قدرت کے تکوینی نظام کے خلاف ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ سلسلۂ فکرِ انسانی میں بعض افراد آنے والی نسلوں کے لئے فراخی نظر اور چراغِ رہ گزر کے اسباب فراہم کرنے میں معاون ہوتے ہیں۔

اس مضمون کے تین مقدمات ہوسکتے ہیں۔ اقبال کا سرسید یا علی گڑھ تحریک سے فکری وذہنی سطح پر قربت یا اقرار واعتراف اور استفادہ۔ دوسرے علمی وعملی طور پر علی گڑھ سے اقبال کی وابستگی اور اشتراک وتعاون۔ تیسرے علی گڑھ کے احباب واساتذہ کی اقبال شناسی اور باز آفرینی۔ تیسرے پہلو کے تفصیلی تجزیے سے قبل پہلے اور دوسرے زاویوں پر چند اشارے پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ اقبال کو خاندانِ سرسید سے جو قربت اور ارادت تھی وہ کسی دوسرے خانوادے سے نہ پیدا ہوسکی وہ سرسید کو کم وبیش بیس سال تک دور ونزدیک سے دیکھتے رہے وہ کمالاتِ سید محمود کے دل سے قائل تھے۔ سرسید کے انتقال پر قطعِ تاریخ لکھا۔ سید کی لوحِ تربت پر ۱۹۰۴ء میں نظر افروز نظم لکھی۔ پھر اسی خاندان کے چشم وچراغ سرراس مسعود کے انتقال پر ۱۹۳٦ء میں نظم لکھی۔ ان کی بیٹی کی رحلت پر بھی نظم لکھی تھی طلبائے علی گڑھ کے نام والی نظم بھی ایک یادگار پیغام کی حامل ہے۔ کلامِ اقبال کسی دوسرے خاندان کو یہ عقیدت اس تسلسل کے ساتھ پیش نہیں کرتا۔ خود اقبال بھی احسان شناسی کے جذبے سے سرشار رہے۔ اقبال کی عقیدت دیکھئے کہ بچوں کی سرپرستی کے لئے راس مسعود

کے نام وصیت نامہ لکھا۔ اپنے لوحِ مزار پر کندہ کئے جانے کے لئے لکھا ہوا قطعہ راس مسعود کی موت پر ان کے لئے تجویز کیا۔

آپ اسے مبالغہ یا میری عقیدت مندی پر محمول نہ فرمائیں آپ کے استصواب کو یقینی جان کر یہ عرض کرنے کی جسارت کرر ہا ہوں کہ عصرِ رواں میں اقبالیات کو علی گڑھ میں جو عزو افتخار حاصل ہے۔ اس سے برصغیر کیا دنیا کے براعظم بھی تہی دست ہیں۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری اس موضوعِ سخن کے سب سے اہم مصدر ہیں۔ ان کی اہم تصانیف نقشِ اقبال (۱۹۷۷ء) اقبال کی تیرہ نظمیں (۱۹۷۷ء) & Iqbal Essays Studies اقبالیات کی علمی فتوحات میں سرنامۂ عنوان کی حیثیت رکھتی ہیں آج تک کسی دوسرے معروف ناقد کے علمی کشکول میں سرمایۂ اقبال کی یہ فراواں اور فروزاں دولتِ بیدار جمع نہ ہوسکی۔ اقبالیات کے مختلف اسالیب کی تفہیم میں اس شاداب سرزمین میں پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی خدمات پر اکتفا کیا جاسکتا ہے۔

۱۹۷۹ء میں ''نقد ونظر'' کے اجرا کے وقت جو منشور مرتب کیا گیا تھا اس میں اقبالیات کے فروغ پر خاص توجہ دینے کا اقرار واعتراف بھی شامل تھا۔ اس علمی جریدے کا شاید ہی کوئی شمارہ ہو جو اقبال کے حوالے سے خالی ہو۔ اقبالیات کے علمی محصولات میں اسلوب صاحب کا مقام ناگزیر حیثیت رکھتا ہے اب ان سے نہ مفر ہے نہ مجال۔ اقبال شناسی میں وہ ایک مقتدر مصنف ہیں اور محرک بھی۔ یہ بات مجھے اکثر کھٹکتی ہے کہ غالب واقبال پر بیشتر اچھی کتابیں اردو اساتذہ کی مقدرت سے باہر ہیں وہ دوسرے شعبوں کے دانشوروں کی رہینِ منت کیوں ہیں؟ اقبال شناسی میں یہ استفہامیہ ایک اندوہناک صورت رکھتا ہے۔ یہ بات بھی حیرت خیز ہے کہ ایران کے ادب شناسوں نے اقبال کو بڑی قدر سے دیکھا اور مطالعہ کی طرف مائل ہوئے۔ جب کہ غالبیات سے ان کا التفات کم سے کم ہی رہا۔ اس کے برعکس ہندوستان کے فارسی اساتذہ اقبالیات سے چشم پوشی کرتے رہے اور غالب پر ان کی زیادہ سے زیادہ توجہ رہی۔

ان سے قبل خواجہ منظور حسین کی کتاب ''تحریک جدوجہد بہ طور موضوعِ سخن'' میں اقبال کی غزل گوئی پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ جس میں ایک نئی فکر بھی شامل ہے۔ اقبال اور

مغربی شعراء انہوں نے پاکستان کے دورانِ قیام پیش کی۔

آزادی کے بعد ہماری نارسائیوں میں اقبال کونظر انداز کیے جانے کا رویہ بھی شامل ہے۔سرکار کا خاموش اعلانیہ اور ترقی پسندی کے نام پر اقبال سے انحراف وانکار کی تحریک نے اس مطالعہ کومکروہ حدتک ناپسند کیا۔اس عام فضا میں رشید احمد صدیقی اور آل احمد سرور نے اقبال کی بازآفرینی کو باقی رکھا۔اس مطالعہ کو متحرک کرنے میں انہوں نے گراں قدر کام انجام دیا۔رشید صاحب کی مختلف تحریروں میں ان کی بے پناہ عقیدت کے ساتھ ان کی تنقیدی اور تہذیبی تفہیم نے ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔یوں بھی اقبال سے ان کو جو قربت تھی اس کا تقاضا تھا کہ اقبال شناسی میں وہ سب کی رہ بری کرتے۔جدید اردو غزل ہو یا سہیل کی سرگذشت یا ان کی تحریروں کے جملے ترکیبیں اشعار سب میں اقبال کی بازگشت موجود ہے۔ان کے مضامین کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔اس شعبے کی تاسیس میں اقبال کا تعاون بھلایا نہیں جاسکتا۔رشید صاحب کا اقبال سے ملنے کے لئے لاہور جانا اور اقبال کا رشید صاحب سے ملنے کے لئے ان کی قیام گاہ پر حاضر ہونا اس شعبے کی قابلِ رشک سعادت ہے۔اس سرخ روئی میں آپ برابر کے شریک ہیں۔دوسرا اہم نام پروفیسر آل احمد سرور مرحوم کا ہے۔جو اقبال شناسی میں ناقابلِ فراموش شخصیت رکھتے ہیں۔ان کے متعدد مضامین ۱۹۵۴ء تک شائع ہوتے رہے ہیں۔درمیان میں تقریباً بیس سال کا وقفہ حائل تھا۔اقبال انسٹی ٹیوٹ سرینگر سے وابستگی کے بعد مطالعۂ اقبال کی تجدید ہوئی۔''دانشور اقبال'' (۱۹۹۴ء) ایک مستقل کتاب کی حیثیت سے منظرِ عام پر آئی۔ان کا نظام خطبہ''اقبال کا نظریۂ شعر وشاعری'' بھی خاصے کی چیز ہے۔ان کے علاوہ علی گڑھ سے باہر رہ کر انہوں نے اقبال انسٹی ٹیوٹ کے رسالے اقبالیات کے چار شمارے مرتب کیے مذاکروں کے مقالوں کو مرتب کر کے سات کتابیں بھی شائع کیں اسی ادارے کے تعلق سے پروفیسر کبیر احمد جائسی نے بھی دو تراجم پیش کئے۔ڈاکٹر حیات عامر کی کتاب بھی''اقبال اور مابعد تاریخ'' اسی ادارے سے شائع ہوئی ہے۔پروفیسر مسعود حسین خاں کو اقبال شناسی میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ان کے مضامین کی معنویت اور لسانی تفہیم کے مناسبات قابلِ توجہ ہیں سری نگر کے

ادارے سے انہوں نے ایک مونو گراف ''اقبال کی عملی اور نظری شعریات'' شائع کی ہے۔ اپنی سرگذشت میں بھی اقبال کے افکار سے سروکار رکھا ہے۔ جوان کی انا پسند طبیعت کے اظہار سے خالی نہیں ہیں۔ لسانیات کے شعبے سے ڈاکٹر عبدالغفار شکیل نے اقبال کی شعری اور نثری تخلیقات کی جمع وترتیب میں اپنی خدمات پیش کی ہیں۔ ''نوادرِ اقبال اور اقبال کے نثری افکار'' سے ان کی دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔

اقبال کے لفظیاتی نظام پر پروفیسر قاضی افضال حسین کا مضمون اہمیت کا حامل ہے۔ ساتھ ہی جبریل وابلیس کے مکالمہ کا تجزیہ بھی خوب ہے۔ خود اقبال نے لفظ ومعنی کے ارتباط کو جان وتن سے تعبیر کیا ہے۔ لفظ ومعنی کے ارتباط اور استقرار کا ایسا خوب صورت اظہار ادبیاتِ عالیہ میں بھی کم یاب ہے۔ شاید یہاں کے اساتذہ اس طرف توجہ دیں۔ نوجوان اساتذہ کے مشاغل اب کلاسیکی ادب سے بہت کم نسبت رکھتے ہیں۔ تن آسانی اور سہل پسندی کے سبب بھی اقبال وغالب کی طرف التفات کم ہے۔ لیکن راقم مایوس نہیں ہے۔ انھیں تشویق دلانے کی ضرورت ہے۔

پروفیسر ابوالکلام قاسمی کی ''اقبال کی غزل گوئی'' میں اقبال کے تخلیقی مباحث سے خاصا سروکار ملتا ہے۔ بہت سے ذہین اور ذی فکر اساتذہ کا افسانہ وافسوں کے اندیشوں میں گم ہو جانا موجودہ دور کی بڑی عبرت ناک صورتِ حال ہے۔

پروفیسر نورالحسن نقوی کی کتاب عام طلبا کے لئے ایک قابلِ ذکر اور مفید مطالعہ کی راہ نما ہے۔ اقبالیاتی ادب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ادب ودانش کا یہ ناگزیر عنوان ہے جس کو خاطر میں لائے بغیر نہ کوئی بڑا نقاد بن سکتا ہے اور نہ استاذ۔ شعبوں کی شناخت میں ان کے متعین منطقوں اور منصوبوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

تنقید سے صرفِ نظر تحقیق میں بھی یہ امتیاز باقی ہے۔ ڈاکٹر اکبر حسین قریشی آزادی کے بعد اقبالیات میں پہلے پی ایچ ڈی ہیں جن کا مقالہ ''تلمیحات واشاراتِ اقبال'' شائع ہو کر کتابِ حوالہ بن چکا ہے۔ ہندوپاکستان میں یہ مقالہ شائع ہوا ہے۔ دوسرا اہم مقالہ پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی کا ہے۔ ''شعریاتِ اقبال'' کے نگراں ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی

تھے۔ وہ خود شاعری کے رموز سے واقف تھے۔ ڈاکٹر عشرت حسین انور کے مقالے کا ذکر اس سے قبل آچکا ہے۔ خطوطِ اقبال کی جمع وترتیب کے سلسلے میں بھی اسی ادارے نے پہل کی ہے۔ شیخ عطاء اللہ نے مکاتیبِ اقبال کی دو جلدیں میں شائع کیں۔

اقبال کے خطوط کی جمع وترتیب کی یہ پہلی مبارک کوشش تھی جو بعد میں تقریباً گیارہ مجموعوں کی اشاعت کا باعث بنی اور پھر کلیاتِ مکاتیبِ اقبال کی چار ضخیم جلدیں دہلی اردو اکیڈمی نے شائع کیں۔ جس کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ اس صدی میں خطوط کی اتنی بڑی تعداد کے مالک اقبال ہی ہیں۔ تقریباً تیرہ سو سے زائد خطوط کی دست یابی اور اشاعت خود مطالعۂ اقبال کی حیرت فزائی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کلیاتِ مکاتیبِ اقبال کے مرتب کی عدم توجہی سے اس مجموعے میں کئی سو غلطیاں شامل ہوگئیں۔ شعبۂ اردو کے پروفیسر منظر عباس نقوی نے اقبال کے مکاتیب بنام عطیہ فیضی کا اردو ترجمہ شائع کیا اگرچہ اس سے قبل اس مجموعۂ مکاتیب کے دو تراجم شائع ہوچکے تھے۔ بہر حال ان کی یہ تیسری کوشش بھی لائق ستایش ہے۔

یہاں کی اقامت اور استفادے کے علاوہ فارغ ہوکر دوسری بستیاں بسانے والوں کی بھی ایک معقول تعداد ہے۔ جنہوں نے اقبال شناسی کے امکان کو وسیع تر بنانے میں اہم کارنامے انجام دئے ہیں۔ ان خدمات کو علی گڑھ سے منسوب کرنے میں آپ کے آبگینۂ احساس کا پاس ملحوظِ خاطر ہے ورنہ پروفیسر محمد حسن، پروفیسر محمود الٰہی، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، پروفیسر قمر رئیس وغیرہ کے مضامین کو علی گڑھ سے ایک دور کی نسبت دی جاسکتی ہے۔ دوسرے دوست بھی اس فہرست میں شمار کئے جاسکتے ہیں۔ سلسلۂ نسب میں توسیع پسندی ممنوع نہیں بلکہ مستحسن قرار دیا گیا ہے اسی زمرے میں ''حرفِ تمنا'' کے مصنف پروفیسر شمیم حنفی بھی اس مجلس میں شامل ہیں۔

علی گڑھ میں تنقیدی تصورات کے تجزیہ اور استحکام پر بڑی توجہ دی گئی۔ تنقید، فن کے اچھے برے یا کھرے کھوٹے کے درمیان امتیاز قائم کرنے کا نام ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ دانے کے ساتھ ملے خس وخاشاک کو چھان پھٹک کر علیحدہ کرنے کا عمل ہے۔ کاہ از دانہ جدا کردن کو مشرقی روایات میں انتقاد سے تعبیر کیا گیا ہے۔ انتقاد کی یہی کاوش گذشتہ صدی کی ایک

بڑی ادبی یافت ہے۔ جسے اب ایک شعبۂ علم کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ فن پارہ کی پرکھ کے معائر جداگانہ ہیں اور کسی ایک اصول پر ناقدین متفق نہیں ہیں۔ شاید اسی سبب تنقید کے ضابطے بھی بکھرے ہوئے ہیں۔ اور ان کی اجتماعی افادیت بھی مشکوک ہوکر رہ گئی ہے۔ تنقیدی رویوں میں نقطہ ہائے نظر کی کثرت آرائی سے کبھی کبھی اس کی افادیت مشتبہ ہوجاتی ہے۔ نظریوں کے درمیان کشاکش اکثر تصادم کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ اور تنقیدی مقاصد فوت ہوجاتے ہیں۔ علی گڑھ نے جدیدیت کے بحران کو بہت مہمیز کیا اسے کمزور فلسفیانہ اساس فراہم بھی کیا گیا۔ جس میں اقبال کی گنجایش کم تھی۔ ایک پوری نسل غالب و اقبال سے محروم ہوگئی۔ بلکہ اردو قاری سے محروم ہوتی گئی۔ یہ بڑا زیاں تھا۔ پھر ساختیات کی ہوا چلی علی گڑھ میں اس کی گرماہٹ کچھ زیادہ ہی محسوس کی گئی۔ چند دنوں میں اس کا بھی تار و پود بکھر گیا۔ مصطلحات کے بھنور میں تنقیدی نظر کا نایاب ہوجانا فطری تھا۔ علی گڑھ کی بادِ وبائے تنقید سے فائدہ کم زیاں بہت ہوا۔ بھر تخلیق نے انتقاد کو جنسِ کم مایہ قرار دیا۔ تخلیق کے فیض و فتوح سے رجحان میں تبدیلی آئی۔ دریا کے بدلتے رخ کو دیکھ کر اساتذہ بھی تخلیقی تیراکی کے ہنر سیکھ گئے۔

علی گڑھ کی اقبالیات کا ایک دوسرا رخ بھی ہے۔ جو براہِ راست نہ سہی لیکن اس کا ایک سرا ضرور ملتا ہے۔ مجنوں گورکھپوری نے کچھ دن علی گڑھ میں گزارے۔ یہاں آنے سے قبل گورکھپور کی تدریسی زندگی کے دوران اقبال پر ایک کتاب لکھ کر اقبال کو مطعون اور اپنے کو ممنون و متعارف کرا چکے تھے۔ سردار جعفری کا تعلق بھی علی گڑھ سے تھا۔ یہاں سے فراغت کے بعد اقبال کو ترقی پسند ادب میں جی بھر کر ہدفِ ملامت بنایا۔ بعد میں مال و متاع سمیٹنے کی خاطر مراجعت کی اور ستایش سے بھی اقبال کو نوازا۔ جو موقع پرستی کا تقاضا تھا۔ وہ اپنے پرانے خیالات سے دست بردار نہیں ہوئے۔ کیوں کہ یہ ان کی مصلحت، مسلک اور منشور کے خلاف تھا۔ اور سیاسی مفاد کی حصول یابی میں بھی حارج تھا۔ ان کی شاعری میں کلامِ اقبال کا حلول ان کا حرز جان بھی تھا۔ لیکن تنقید کا مدعا کچھ اور تھا۔
بہ قول شاعر

"تنقید لکھتے رہتے ہیں سردار جعفری

انعام کے لئے ہے یہ ان کی گداگری“

علی گڑھ کے اقبالیاتی ادب میں سب سے محترم اور بزرگ نام استاذی شبیر احمد خاں غوری مرحوم کا ہے۔ وہ اسی خاکِ ارجمند سے اٹھے اور اسی دانش گاہ سے مستفیض بھی ہوئے۔ راقم نے ایسا وسیع المطالعہ اور تبحرِ علمی سے بہرہ مند عالم نہیں دیکھا وہ علومِ اسلامیہ پر بڑی عبقری نظر رکھتے تھے۔ وہ فلسفۂ الٰہیات کے ساتھ اشاعرہ و معتزلہ کے مباحث پر دیدہ ورانہ بصیرت کے حامل تھے۔ ادب و تاریخ ان کے ضمنی موضوعات تھے۔ غالب کے وحدت الوجودی عقائد پر ان کے مقالے سے بہتر اضافہ نہ ہو سکا۔ اسی طرح اقبال کے تصورِ زمان و مکان کی تشریح و تعبیر ان کے حوالوں کے بغیر تشنۂ تکمیل ہیں۔ انہوں نے اگر چہ اس موضوع پر مستقل کتاب تصنیف نہیں کی۔ مگر خدا بخش لائبریری نے ان مقالات کو جمع کر کے ایک گراں مایہ تصنیف ’اقبالیات‘ شائع کی ہے۔ یہ اقبالیات میں ایک نادر و ناگزیر دستاویز ہے۔

ابلیس کی شورائی مجلسیں

فکر و فلسفہ سے قطعِ نظر اقبال کے شعری اکتسابات اور ان کے حدود کا احاطہ ناممکن نہ سہی مشکل ضرور ہے۔ ان کی تخلیقات میں قوتِ نمو کا سیلِ بے اماں معجزات کی دنیا سے معمور ہے۔ قدیم اور کلاسیکی روایات سے بھرپور فائدہ اٹھانے کے ساتھ ان میں معانی اور مفاہیم کے نئے اسالیب اس طرح پیوست کیے گئے ہیں کہ تصورات کی دنیا ہی دگرگوں ہوگئی۔ آدم و ابلیس کے قصے سے کون واقف نہیں؟ اقبال کی کارگہِ فکر میں روایتی آدم اور ابلیس سے متعلق خیالات میں تنوع اور تبدیلی نے نئے پیکر پیش کیے ہیں۔ میلادِ آدم اور انکارِ ابلیس کی نئی تعبیر اقبال کی اختراعی طبیعت کی مرہونِ نظر ہے۔ اقبال کے فن میں یہ دونوں پیکر بڑی معنویت اور کیفیت کے حامل ہیں اقبال نے ابلیسی مجلسوں کا احوال ''خضرِ راہ'' میں اشارتاً بتایا تھا اسے جمہوری قبا میں زیب تن کر کے دیوِ استبداد کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ ایوانوں میں زرگری اور سرمایہ داری کی بدترین سازشوں کا کھیل نیلم پری کی مانند ہے جو ناداروں کے استحصال کے لئے نظم و آئین مرتب کرتا ہے۔ اقبال کے نزدیک اس وقت اشترا کی نظام ہی مرضِ کہن کا چارہ تھا۔ جس کی اقبال نے بھرپور تائید و توثیق کی تھی۔ کیا خبر تھی کہ وہی اقبال پندرہ سال بعد اشتراکیت کے نظام کو حیلۂ پرویزی کہہ کر مسترد کر دیں گے۔ اشتراکی مجلسوں میں ابلیسیت کی کارفرمائی کا مشاہدہ ان کے لئے غیر متوقع بھی نہ تھا۔ اقبال نے بہت پہلے سینۂ کائنات کے

اس راز کو فاش کر دیا تھا کہ حکیمِ معاش کے فلسفہ کی بنیاد سراب سے زیادہ سچائی نہیں رکھتی۔

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو تو کیا
طریقِ کوہ کن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

بالِ جبریل کی اس پیشین گوئی کو حقیقت میں تبدیل ہونے میں تقریباً نصف صدی درکار تھی بالآخر اس کا شیرازہ خزاں رسیدہ پتوں کی طرح بکھر گیا۔ اقبال نے ابلیس کی ''مجلسِ شوریٰ'' کی محفل سجائی۔ فن میں قدیم تلمیحات کے توسط سے نئی توانائی پیدا کی۔ نظم کی صورت میں ایک لازوال تخلیق پیش کی۔ جس نے ہر دور کے ہنرمندوں کو متاثر کیا۔ ایسی مثال کم ملے گی کی ایک نظم متعدد تخلیق کے لئے تحریک و تبریک بنے اور فن کو مہمیز کرتی رہے۔ اقبال کے خیالات سے انحراف و اقرار ممکن ہے۔ مگر تخلیق کو اقبال کی سربراہی تسلیم کرنی پڑے گی۔ اقبال کی نظم ''ساقی نامہ'' نے بھی کئی شعراء کو متاثر کیا اور انہوں نے پیرویٔ اقبال کی کوشش کی۔ یہاں بھی صورتِ حال یہی ہے۔ ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' نے کئی لوگوں کو مجلس منعقد کرنے کے لئے متوجہ کیا۔ جن میں کیفی اعظمی کی نظم سرِ فہرست ہے۔ یہ سچائی بھی سامنے رہے کہ ترقی پسند تحریک کے تگ و تاز میں اقبال کی حرارت ہمیشہ جولاں رہی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ تحریک سے وابستہ افراد اس اعتراف سے مصلحتاً گریزاں رہے۔ اس بدیہی حقیقت کے باوجود بدگمانیاں پھیلاتے رہے۔ قابلِ ذکر ترقی پسند ادیبوں کی تخلیقات میں کلامِ اقبال کا بوس بن کر ان کے شعر و فن میں ظاہر ہوتا رہا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اقبال سے حسب مقدار استفادے نے ان کے فن کو اسی قدر توقیر بخشی۔ جوش، فیض و سردار اور کیفی سب کا فن بارِ ثبوت فراہم کرتا ہے۔ اقبال کے موثرات پوری صدی کے فن پر محیط ہیں۔ فیضان رسی کی یہ صورتِ حال آئندہ بھی جاری رہے گی۔ مگر بقدرِ ظرف۔ کیفی بھی اپنی بساطِ فکر کے مطابق اقبال سے کسبِ فیض کرتے رہے۔ چوں کہ وہ خود خیال کی رفعتوں اور فن کی صناعی سے زیادہ باخبر نہ تھے اس لئے فیضانِ نظر کا فقدان ہی رہا۔ دوسری بات بھی کم اہم نہیں کہ بیشتر ترقی پسند شعراء کے یہاں جرأت گفتار کی وہ جولانی جمع نہیں ہو پائی۔ جس کا تقاضا تھا۔ کیوں کہ ان شعراء کی تربیت ایک مخصوص مذہبی ماحول میں ہوئی تھی۔ اس کے حصار سے نکلنا آسان بھی نہ تھا۔

اشتراکیت کے مطالبات بالکل مختلف تھے۔ اس کشمکش یا آویزش نے بیبا کی نظر سے محروم رکھا۔ ان کے عقائد کے ساتھ ذہنوں کی پرورش اور روایتی اسلوبِ زندگی نے دامن تھام رکھا تھا۔ یہ بات تقریباً سب پر عائد ہوتی ہے۔ دوسری طرف بیشتر کا تعلق زمیندارانہ گھرانوں یا شہری یا قصباتی معاشرے سے تھا جس کے کچھ اپنے اقدار تھے۔ جوسرکشی میں مانع تھی۔ کیفی کی تربیت مجلس و مدرسہ کے ساتھ محراب و منبر کے زیرِ سایہ ہوئی تھی۔ ان اقدار سے بہ آسانی انحراف ممکن نہ تھا۔ پھر بھی انہوں نے بڑی حد تک ترکِ رسوم کی پابندی کی۔

مجلسِ شوریٰ کا دوسرا اجلاس ہو یا رام کا دوسرا بن باس اسی کشمکش کے نتائج ہیں۔ یعنی ماقبل کی روایتوں کو نیا مفہوم دینے کی تخلیقی جرأت۔ اقبال کی نظم کے نفسِ مضمون کے برخلاف اب اشتراکیت کے غلبہ کو راہِ نجات تصور کرنے کی پیش گوئی ان کا سیاسی نظریہ تھا۔ جس کے وہ معترف تھے اور ترجمان بھی۔ ابلیس کو تشویش ہے کہ

ہوگیا کس طرح انساں ہم سے اتنا منحرف
اس کے کانوں میں نہ جانے کس نے پھونکا یہ فسوں

پہلے مشیر کے جواب کا تیور تلخی و تیزاب سے مرکب ہے۔

تیرے کہنے سے جسے محکم سمجھ بیٹھا تھا میں
نکلا تارِ عنکبوت آخر وہ ابلیسی نظام

دوسرا مشیر بھی کڑواہٹ کا لہجہ لئے ہوئے ہے اپنے آقا کو دوبدو جواب دے رہا ہے۔

”آجر و مزدور کا جب تک رہے گا یہ تضاد
دعویٔ وحدت ترا ناقابلِ تفہیم ہے“

تیسرا مشیر بھی حرفِ شکایت کے ساتھ ابلیسی نظام کی ناکامی پر نادم ہے۔ چوتھے مشیر کی راست بیانی اور بے باکی زیادہ موثر بن گئی ہے۔ فاشتی آمریت کے سامنے اشتراکی انقلاب خس و خاشاک سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

رومۃ الکبریٰ کے ایوانوں سے اٹھا ہے جو شور
دب کے رہ جائے گا اس میں سارا شورِ انقلاب

تیسرے مشیر نے حرفِ مکرر کے طور پر مداخلت کی اور روس کو بساطِ ارض پر کوہِ حقیقت کہہ کر ابلیسی خواب کو ریزہ ریزہ ہونے کا اندیشہ ظاہر کیا ابلیس اس گفتگو سے ناراض ہو کر اشتراکیت کے بحرانوں کو فالِ نیک کہتا ہے۔ اس سے چین کا تصادم اور دولگا سے پولینڈ کی بدگمانی کو یاد دلاتا ہے۔ پانچواں مشیر زیادہ بلند بانگ نظر آتا ہے۔

ہوگی تیری طبعِ نازک پر گراں یہ گفتگو
کس بلندی پر ہے لینن کا جہانِ آرزو

غرض ابلیس اور اس کے پانچ مشیروں کے درمیان یہ مکالماتی نظم کیفی کی بیانیہ شاعری کی اچھی مثال ہے۔ یہ مسلسل بھی ہے اور موثر بھی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ طویل بیانیہ نظموں کی طرح متوجہ ہوتے تو اردو کو شاید اور بھی اچھی تخلیق کا سرمایہ نصیب ہوتا۔ اس نظم کے آہنگ میں لفظیات کو بڑا دخل ہے۔ اسلوب اور پیکر موضوع اور مکالمہ اقبال سے مستعار ہے۔ لفظیات میں بھی اقبال کی بھرپور نمایندگی ہو رہی ہے جس سے نظم کی پوری فضا اقبال کے موثرات سے معمور ہے۔ مثلاً جہانِ کاف ونون، زاروزبوں، جھک کر چومتا، شہباز وممولے، رومۃ الکبریٰ، جہانِ آرزو، رنگ وبو، آشفتہ مغزِ آشفتہ ہو، تیغ ید اللہی وغیرہ۔ اس کے علاوہ متعدد مصرعوں میں اقبال کا اسلوب سایہ نشین ہے۔ تلمیحات اور اشارات کا وافر حصہ بھی کلامِ اقبال کی یاد دلاتا ہے۔ اقبال کا پرتو ہر جگہ نمایاں ہے۔ مگر وہ زورِ بیان، پرشکوہ اسلوب اور افکار کا سیلاب نظر نہیں آتا۔ جو موج در موج کی صورت اقبال کے یہاں موجزن ہے۔ نظم میں ارتقائی صورتِ حال نہیں بلکہ تکرار سے یہ دوسری مجلس تاثر نہیں دے پاتی۔ صرف 60 اشعار کہتے کہتے لگتا ہے کہ شاعر کا دم پھولنے لگا۔ اور مجلس ختم ہو جاتی ہے۔ اقبال کی نظم میں 76 اشعار ہیں۔

اردو تنقید میں بہت اہم نام پروفیسر محمد حسن کا ہے۔ جو اپنے مارکسی نظریات کے لئے معروف ہیں۔ وہ خلوص کے ساتھ اپنے نظریہ پر قائم ہیں۔ جب کہ بیشتر ترقی پسند مصلحت اور مفادات کی خاطر اپنے نظریوں سے دست بردار ہو گئے۔ ڈاکٹر محمد حسن کو یہ بات بہت شاق گزرتی ہے۔ جس کا اظہار وہ اپنی اکثر تحریروں میں کرتے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں انھیں

سب سے زیادہ مایوسی سردار جعفری سے ہوئی۔ ۱۹۹۴ء میں ترقی پسند شعراء کی ایک جماعت اقتدار کی حمایت میں کمربستہ ہوکر میدان میں اتری۔ جناب راجیو گاندھی کے وزیر اعظم ہونے پر ان کی سال گرہ کے بہانے مبارک باد دینے کے لئے علی صدیقی کی سربراہی میں یہ شعراحاضرِ خدمت ہوئے۔ اور بیان بھی جاری ہوا۔ ڈاکٹر محمد حسن نے یہ نظم خدا بخش لائبریری کے مہمان خانہ میں قیام کے دوران ۲۷ راگست ۱۹۸۹ء کو لکھی تھی۔ ڈاکٹر محمد حسن کے لئے یہ سانحہ نا قابلِ برداشت تھا۔ انہوں نے ابلیس کی تیسری مجلس آراستہ کی جس کے کردار، کیفی، مجروح اور اختر الایمان ہی ہیں۔ یہ نظم کئی اعتبار سے کیفی کی نظم سے بہتر ہے۔ ۱۹۹۴ء میں دہلی کے اردو اساتذہ کے مشاعرے میں اس نظم کو بڑی داد ملی۔ یہ نظم قدرے مختصر ہے یعنی کل 31 اشعار پر مشتمل ہے۔ اس مکالمہ میں ابلیس کے ساتھ کل دو مرید شامل ہیں۔ اس نظم میں بھی اقبال کا عکس بہت نمایاں ہے۔ اقبال کا پورا مصرعہ بڑا مزہ دے رہا ہے۔

''آہ اے نادان تو واقف نہیں اس راز سے''

نظم ہلکے پھلکے لفظوں کی سادہ بیانی کے ساتھ رواں دواں ہے اور پر کیف بھی ہے یہ نظم ردیف وقافیے کے اہتمام سے زیادہ سروکار نہ رکھنے کے باوجود خوش آہنگ ہے۔ پہلے اور دوسرے مرید کے ساتھ ابلیس کا مکالمہ خاصے کی چیز ہے۔ ابلیس کے آخری مکالمے میں ہی شاعر نے عرضِ حال کیا ہے۔ جو شعری تخلیق یا تیسری مجلس کا سبب بنا۔ غور طلب ہے کہ اشارے کنایہ میں ان شعراء کی شبیہ کس طرح نمایاں نظر آتی ہے اور کیسا لطیف طنز ان کی شخصیتوں اور تصورات کی تبدیلی پر کیا گیا ہے۔ دوسرے مرید کا مشورہ تھا کہ اہلِ علم کو نیزۂ قلم اور نوکِ زبان سے محروم کر دیا جائے تا کہ کوئی سچی بات کاغذ پر نہ لکھی جا سکے اور نہ ہی بیان میں آ سکے۔ ابلیس خندہ زن ہے کہ یہ کام تو بہت پہلے ہو چکا۔ اعلانِ حق کے مدعیان مدخولۂ سرکار ہو چکے اور بندۂ مزدور کے حامیان سیم وزر میں تولے جا چکے ہیں اب ان کا قلم بھی خاموش رہے گا اور گویائی بھی مسلوب رہے گی۔

ایک شاعر تھا جو کل گاتا تھا مزدوروں کے گیت
کرتا تھا اعلانِ حق دار ورسن والوں کے بیچ

مفلسوں کی بات کرتا تھا ان زرداروں کے بیچ
کیف تھا اس کو نشہ محنت کشوں کی جیت کا
ہم نے لاکھوں میں لیا ہے مول اک اک گیت کا
کچھ شرابوں سے چکایا کچھ رقم سے دھوم سے
کھینچ لی ہے غیرتِ فن اب اس کے اک اک روم سے
دوسرے شاعر نے رکھے دار پر سر کے چراغ
وہ قلم کا مدح خواں وہ فکر سے روشن دماغ

فرازِ دار پر سروں کے چراغ رکھنے والا اب دیو استبداد کے پرستاروں میں شامل ہے اس کا فن شہرت وسیم کے عوض خریدا جا چکا ہے ایک اور فن کار تھا جو انسانیت کی بہبود کے لئے نغمہ سرا تھا۔ ضمیر و ایمان کی باتیں کیا کرتا تھا وہ بھی زرگروں کے زیرِ دام آ چکا ہے۔

ایک لڑکا بکنے والوں کو ستاتا تھا بہت
جو نہ بک سکتے تھے وہ ان کو لبھاتا تھا بہت
اس کو اب پنجرے میں سونے کے مقید کر دیا
ہم نے سیم و زر سے اس کو جھولیوں میں بھر دیا

اس نظم میں اقبال کے بعد اصغر گونڈوی کے شعر کو بڑی خوب صورتی سے وہ متن میں شامل کر کے تضمین کی نئی صورت پیدا کی گئی ہے۔ آخر کار شاعر کا جذبِ دروں ابل پڑتا ہے۔

اب خوشامد، مصلحت، حرفِ ہنر ہے دوستو
صدق سے انصاف سے صرفِ نظر ہے دوستو
سب کا دیں اب زر پرستی سب کا لالچ ہے خدا

ان دونوں مجالس کے موضوعات مختلف تھے۔ فنی اسالیب کے انداز بھی جدا تھے۔ چوتھی مجلس میں اقبال کی بصیرتوں کی توثیق کی گئی ہے اور اسلام کی انقلابی روح سے چار دانگ عالم میں نئے اضطراب کی نمود کو خوش آمدید کہا گیا ہے۔ سید غلام سمنانی مرحوم دہلی یونیورسٹی

کے ذاکر حسین کالج میں انگریزی کے استاد تھے۔ ان کے تبحرِ علمی کی مثال ناچیز نے کہیں نہیں دیکھی۔ گہرے مطالعہ کے ساتھ شعری تخلیق میں بلا کا درک رکھتے تھے۔ اقبال سے انھیں قلبی تعلق تھا۔ پیامِ مشرق کی ''لالۂ طور'' کی رباعیوں کا انگری میں بہت ہی دل کش ترجمہ کیا تھا۔ مسجدِ قرطبہ کی واپسی پر 64 اشعار کی مثالی نظم کہہ کر خراجِ تحسین حاصل کر چکے تھے۔ کئی کتابیں ان کی یادگار ہیں۔ انہوں نے 1994ء میں چوتھا اجلاس پیش کیا۔ 130 اشعار پر مشتمل یہ نظم معارف نومبر 1994ء میں شائع ہوئی تھی۔ نظم شوکتِ بیان اور اشعار کے گہرے ارتباط و تسلسل کی نظیر ہے یہ رودِ کہسار کی روانی اور رجز کے جوش وخروش سے بھی مالا مال ہے۔

کیوں دگر گوں ہو رہا ہے پھر مزاجِ کائنات
تھا مرا محکوم کل تک یہ جہانِ بے ثبات
تھی زمامِ کارِ عالم میرے شر کے ہاتھ میں
میرے ہی شر کے فسوں خوردہ رہے یہ شش جہات

ابلیس کے ساتھ یہاں چھ مشیروں کے مکالمات ہیں اور ہر خطاب دس اشعار پر مشتمل ہے ان کے علاوہ اس نظم میں 'ندائے غیب'، 'نغمۂ ملائک، سخنِ شاعر اور استدراک، جیسے عنوانات کے اضافے نے معانی آفرینی کے نکات پیدا کیے ہیں ابلیس کی آخری گفتگو قابلِ ذکر ہے۔

میں کہ ہوں آتش نفس، آتش نژاد، آتش ضمیر
میری قسمت میں نہیں فیضِ نجاتِ اخروی
ہے مرا پرداختہ اس دور کا سارا نظام
ہے مری پروردۂ آغوشِ تہذیبِ نوی
اشتراکیت ہوئی میرے نفس سے بارور
میرے ہی زلہ ربا ہیں مزدکی ومانوی

سید غلام سمنانی مرحوم نے ایک اور نکتہ پیدا کیا ہے ابلیس کی زبان سے پورے دس

اشعار میں شاعرِ مشرق کو خراج کے ساتھ اقبال کے ہاتھوں ابلیس کی زبان سے خودا سے خوار وزبوں ہونے والی ملامتوں کا بھی اقرار کرایا ہے۔ فلسفی شاعر کے حضور اس اعتراف کی نوعیت دوسرے شعراء کی عقیدت سے زیادہ فکرانگیز ہے۔

وہ حکیمِ ارضِ مشرق نغمہ سازِ بے بدل
سرگروہِ عاشقاں، سرخیلِ اربابِ ہمم
صاحبِ ضربِ کلیم وجانِ اسرار ورموز
دیکھتا ہے دل کے آئینہ میں تقدیرِ امم
خاکدانِ دہر میں کیسی خوشی میرے لئے
سمِّ قاتل بن گئی اس کی خودی میرے لئے

اس کے بعد ملائک نغمہ سرا ہیں جو اقبال کی ہی پیروی میں ہے۔ اقبال کے کلام میں ملکوتی آوازوں کا منظر نامہ ایک منفرد نظریۂ ترسیل کے ساتھ محاکاتی دل کشی بھی رکھتا ہے۔

کر کے عزمِ انتقاد، مجلسِ تنظیمِ عدل
امتِ ختم الرسلؐ خیرالورا اٹھی تو ہے
قاضیٔ تقدیر کا یہ فیصلہ صادر ہوا
دور اب فرماں روائی کا تری آخر ہوا

آخر میں پیغام کے ارتکاز یعنی استدراک پر نظم ختم ہوتی ہے جو ابدی پیغام کی حامل ہے۔

قربتِ تیر وکماں سے تابکے آخر گریز
صحبتِ شمشیر سے کب تک یہ آخر احتراز
سامنے دیکھو صف آرا لشکرِ ابلیس ہے
یہ بتاؤ کیا سماع وقول کا ہے اب جواز
دیکھنی ہے ان کے ہاتھوں میں بھی اب تیغ دودم
کام جن کا ہے فقط تسبیح وتہلیل ونماز

اعتبارِ گردشِ ارض وسما کچھ بھی نہیں
زندگی جہدِ مسلسل کے سوا کچھ بھی نہیں

یہ نظم اپنی نوعیت کے اعتبار سے انوکھی اور عصری سچائیوں کا بے کم وکاست اظہار ہے۔ایک دوسرے کم معروف شاعر فنا پرتاب گڑھی (مقیم احمد آباد) نے پانچویں مجلس منعقد کی۔نظم مختصر ہے اس میں کل 19 اشعار ہیں۔تنوع اور تکنک کے اعتبار سے بھی نظم زیادہ پر اثر نہیں ہے۔کچھ اشعار رواں اور پرشور لہجے کے ترجمان ہیں۔خیال یہ ہے کہ مغرب کے ایجاد کردہ ہلاکت آفریں ایٹمی ہتھیاروں سے بنی نوع انسان کی خوب صورت دنیا عنقریب صفحۂ وجود سے ختم ہونے والی ہے یہ سب کچھ ابلیس کے اشاروں پر ہورہا ہے۔اس رمز کو اس کے مشیر سمجھنے سے قاصر ہیں۔ابلیس مخاطب ہے۔

ان ہلاکت خیز ایجادوں کو میرا ہر مشیر
اپنی نادانی سے سمجھا ہے مفیدِ خاص وعام
اور میں ایجاد ہائے گوناگوں سے روز وشب
میکدے میں بیٹھ کر لیتا ہوں اپنا انتقام

ان چاروں نظموں کے ذکر میں میرا معروضہ یہ ہے کہ اقبال ہر دور کے شعروفن کی سیرابی کرتے رہیں گے اور تخلیق کے امکانی جہات کی نشان دہی میں چراغِ رہ گزر کا کام انجام دیں گے۔یہ نظمیں میرے علم میں تھیں۔نہ جانے ابھی کتنی اور تخلیقات ہوں گی جن تک میری رسائی نہ ہوسکی۔شاید کچھ قلم کاروں نے اس طرف توجہ دی ہو میری محرومی ہے کہ ان کا متن نہ دیکھ سکا۔

بہر حال یہ موضوع فن کا ہمیشہ تعاقب کرتا رہے گا۔چوں کہ خیروشر یا نظریہ ونہاد اور سیاسی آویزشوں کا سلسلہ ایک دائمی حیثیت رکھتا ہے اس لئے اس کی معنویت ہر عہد کے دانش وبینش کو متاثر کرتی رہے گی۔یہ صرف ایک تلمیح، علامت یا تاریخ کا حادثہ نہیں رہا۔اقبال نے اسے ایک متحرک علامت اور دلنشین استعارہ بنادیا ہے۔جس کے پندار کی پنہائیاں بیکراں وسعتوں سے آباد ہیں۔عنوان کی طرح اس نظم کے متعدد اشعار ضرب المثل بن کر وظیفۂ لب کی حیثیت اختیار کرچکے ہیں۔جو اس نظم کو یاد دلاتے رہتے ہیں۔

چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر
نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب

یہ پریشاں روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ ہو
پادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں
کاروبارِ شہریاری کی حقیقت اور ہے

اقبال کی مکالماتی نظموں کی مخصوص تکنک کی حامل یہ ایک طویل بیانیہ اور اثر آفریں نظم ہے جس میں تمثیلیت اپنے اتمام پر ہے دوسرے حضرات کی جرأت قابلِ ستائش ہے کہ ایک شاہکار تخلیق کی پیروی کے تمام خطرات کو خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کیا گیا۔ بہ قولِ غالب کہ قطرۂ شبنم کے عرضِ شوق کی جرأت کو آفریں ہو کہ اپنی بے مائیگی کے باوجود خورشید کی تاب وتپش سے آنکھیں دو چار کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔

التفاتِ شبنم و خورشیدِ تاباں دیدہ ام
جرأتِ باید کہ عرضِ شوق دیدارش کنم

Professor
MOHAMMAD HASAN
M.A., LL.B., Ph.D.

D-7, Model Town,
Delhi-110009
☎ 7234474
7244819

Date ....

ڈاکٹر عبدالحق کے نام

عبدِ حق ہر قدم پر مجھ کو یہ سچ بتلا دو
کہ تمہیں مجھ سے عقیدت ہے تو کیا بات ہے

مولوی ہوں نہ میں زاہد نہ میں عالم نہ فقیہ
مجھ سے منسوب شرافت ہے تو کیا بات ہے

دین سے مجھ کو تعلق ہے نہ دنیا سے غرض
اس پہ بھی مجھ پہ عنایت ہے تو کیا بات ہے

تم کو اسلام کے احکام کی پابندی ہے
ایک کافر سے ارادت ہے تو کیا بات ہے

جام و پیمانہ سے ہم کو بھی ہے نسبت
کرم اس پر بھی نہایت ہے تو کیا بات ہے

نیک بندے ہو اور اس پہ ہو پابندِ صلوٰۃ
میری رسوائی سے جو نسبت ہے تو کیا بات ہے

حرم و دیر سے مطلب نہ خدا کا قائل
پھر بھی مجھ سے جو محبت ہے تو کیا بات ہے

زندگی بھر میری ویران کوئی دوست نہ یار
مجھ کو حاصل کوئی راحت ہے تو کیا بات ہے

مجھ پہ ضائع نہ کرو اپنی عنایت کے گہر
مجھے احساسِ ندامت ہے تو کیا بات ہے!

دوست ہوں میرے جو رنجور ہیں غم دیکھ کے بہت
یوں بھی اشکوں سے مرا دامنِ دل نم ہے بہت
جسم زرد کا نہ اندیشہ نہ ماضی کی تڑپ
خواب ہیں میرے ادھورے یہی ماتم ہے بہت

مختصر ہوں کے لیے راز کا جینا ہے بہت
یہ متاعِ دو جہاں ہے یہی عالم ہے بہت

Professor Emeritus, Jawaharlal Nehru University, New Delhi-110067

سی/۱۴۹ غالب نما
حالی روڈ، گل گشت،
ملتان۔ ۶۰۷۰۰
ٹیلی فون: ۵۲۱۴۵۵ نمبرز
۵۲۲۴۲۴

لطیف الزماں خاں

یک شنبہ ۲۷ ستمبر ۱۹۹۹ء

گرامی قدر، تسلیمات

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ شاید آپ کو یاد ہو ۱۹۹۲ء کے اوائل میں ڈاکٹر لطیف صدیقی صاحب کے ہاں چند روز کے لئے مقیم تھا۔ آپ سے بھی نیاز حاصل ہوا تھا۔ یہ بات بھی آپ کے علم میں ہوگی کہ میرا پہلا اور آخری عشق غالب ہے، لیکن عقیدت صرف رشید صاحب سے ہے۔ اب تک میں اُن کی بارہ کتابیں شائع کرا چکا ہوں۔ بارھویں کتاب "مکاتیب" حصہ اول دو تین ماہ ہوئے شائع ہوئی ہے۔ انشاء اللہ جلد دوم دسمبر تک چھپ جائے گی۔

علی گڑھ میں میرے کرم فرماؤں کی کمی نہیں مگر میرے سالہا سال [illegible] میں میرا [illegible] آپ کے بھائی، ایک دوست ہے۔ آپ بھی جانتے ہیں میر الٰہی ندیم صاحب۔ انہی نے آپ کی کتاب "رشید احمد صدیقی ـ افکار و اسالیب" کی پہلے فوٹو اسٹیٹ اور پھر اصل کتاب بھیجی۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ نے بہت اچھا کام کیا ہے۔ یہاں میرے ایک عزیز دوست لطیف صدیقی صاحب ہیں۔ رشید صاحب کے پرستار ہیں۔ میں نے آپ کی کتاب کی فوٹو اسٹیٹ انہیں بھیج دی۔ مجھ سے انہوں نے دریافت کیا کہ کتاب میں سب سے اچھا مضمون کون سا ہے؟ میں نے کہا ڈاکٹر عبدالحق صاحب کا مضمون "رشید احمد صدیقی کا ثقافتی سیاق"۔ میرے نزدیک سب سے اچھا مضمون کہا جا سکتا ہے جو آج تک اس [illegible] منظر میں رشید صاحب کے بارے میں کوئی اور مضمون نہیں لکھا گیا۔

۲ ستمبر کو انہوں نے لکھا: ـ "رشید احمد صدیقی ... اور اقبال دونوں کا خمیر تقریباً ایک ہی مٹی سے اٹھا تھا کہ ان کی شخصیت کی تشکیل میں آبائی وطن اور اقدار کو بڑا دخل تھا۔ اس لحاظ سے بھی ڈاکٹر عبدالحق کا مضمون نہایت عمدہ مضمون ہے۔ اسے کتاب کا سب سے اچھا مضمون بھی کہہ سکتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسن کا مضمون [illegible] کی بہت اچھی مثال ہے۔ عبدالحق کا مضمون فکری ہے اور محمد حسن کا مضمون ذاتی [illegible]۔ خود ڈاکٹر عبدالحق اقبال اور رشید احمد صدیقی سے بہت متاثر لگتے ہیں۔ [illegible] مضمون [illegible] لکھا گیا ہے۔"

لطیف صدیقی وسیع المطالعہ ادیب ہیں ان کی شاید ہی کوئی تحریر ہو جس پر انہوں نے میری رائے طلب کی ہو اور میں نے بھی انہیں وہی لکھا جو میرے ضمیر کی آواز تھی۔ جب انہوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ "رشید احمد صدیقی ـ افکار و اسالیب" میں سب سے اچھا مضمون کون سا ہے؟ تو فوراً "رشید احمد صدیقی کا ثقافتی سیاق" میرے ذہن میں [illegible] اسباب بھی لکھوائے۔ رشید صاحب کی تحریر [illegible] محمد حسن نے آپ کے ایک بے مثل مضمون لکھوایا۔

G R Malik
Professor of English
University of Kashmir
Srinagar 190 006

Date 17 May 2005

بسم اللہ الرحمان الرحیم

برادرِ گرامی قدر پروفیسر عبدالحق صاحب

"اقبال کی شعری و فکری جہات" موصول ہوئی اور اس کے ساتھ آپ کا شفقت و محبت سے لبریز عنایت نامہ بھی۔ قلب و نظر ابھی آپ کی شناسائی کی لذت سے پوری طرح لطف اندوز بھی نہ ہونے پائے تھے کہ رعنائی شخصیت ایک اور طرح جلوہ گر ہوئی۔ "سراپا نورم از نظارہ تو" والا انتساب ایسا لگا کہ جیسے ذرۂ ناچیز کو آفتاب سے نسبت دی جا رہی ہو۔ یہ آپ کی وسعتِ نظر اور فراخی قلب ہے ورنہ میں کیا میری بساط کیا۔

کتاب ہر لحاظ سے میرے لئے ایک گرانقدر تحفہ ہے۔ "اقبال اور غالب شناسی" کے زیر عنوان آپ کا مبسوط مقالہ فکر و نظر دونوں کو جلا بخشتا ہے۔ ژرف نگاہی، ندرتِ فکر اور ادبی بصیرت الفاظ اور ان کے دروبست میں منعکس ہے اور جامعیت اتنی بسیط کہ مقالے کے اندر ایک پوری کتاب سما گئی ہے شاید اسی طرح جس طرح غالب پر اقبال کی نظم اور "جاوید نامہ" میں ان کی غالب کے ساتھ گفتگو غالب کا جامع ترین تجزیہ بھی ہے اور محاکمہ بھی۔ آپ نے جس خوبی کے ساتھ اس نکتے کو ابھارا ہے وہ آپ ہی کا حق ہے۔

میری حالت کچھ عجیب سی ہے اب تو الحمد للہ آپ کے ساتھ شناسائی پیدا ہو گئی ہے تو یہ احساسِ حسرت دامنگیر ہو گیا ہے کہ اس تعلق کے قائم ہونے میں اتنی تاخیر کیوں ہو گئی۔ یہ قربت پہلے پیدا ہوئی ہوتی تو اس نیازمند کو آپ سے اکتسابِ فیض و [illegible] کے زیادہ مواقع نصیب ہوئے ہوتے۔ بہر حال یہ اللہ کے فیصلے ہوتے ہیں اور اس کی مصلحتیں وہی جانے۔ اسی سے دعا ہے کہ ہمارا یہ تعلقِ خاطر خلوص اور بے لوثی کے ساتھ تا حیات قائم رہے آمین۔ آئندہ جب بھی دلی آنے کی کوئی تقریب پیدا ہوئی تو آپ سے شرفِ ملاقات حاصل کرنے کا اشتیاق رہے گا۔ انشاء اللہ۔

آپ کا بھائی۔

GRMalik